

میراشعوری سفر

انفرادیت سے اجتماعیت کا سفر

ڈاکٹر عابد علی ملک

(MBBS, FCPS)

حقوق اشاعت

2026 ڈاکٹر عابد علی ملک۔ تمام حقوق محفوظ ہیں۔ مصنف کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے

کسی حصے کو تجارتی مقصد کے لیے نقل، محفوظ یا تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کتاب مصنف کے ذاتی فکری و عملی سفر کی روداد ہے۔ اس میں بیان کیے گئے خیالات ایک ارتقا پذیر

فکری سفر کی نمائندگی کرتے ہیں، کسی حتمی علمی یا فقہی موقف کا دعویٰ نہیں۔

انتساب

ان دوستوں، اساتذہ، رفقاء اور اہل خانہ کے نام جنہوں نے میرے سوالوں کو سمت، میری کمزوریوں کو
آئینہ، اور میرے سفر کو رفاقت دی۔

پیش لفظ

میں سے ہم تک کچھ سفر نقشے سے شروع ہوتے ہیں اور کچھ سوال سے۔ میرا یہ سفر بھی ایک سوال سے شروع ہوا: میں اپنی زندگی کو بہتر کیسے بناؤں؟ پھر آہستہ آہستہ سوال بدلنے لگا۔ میں کیسا انسان بنوں؟ میرا علم اور میری صلاحیت کس کے کام آئے؟ ایک بہتر گھر، ایک بہتر جماعت، ایک بہتر ادارہ اور ایک بہتر معاشرہ کیسے بنتا ہے؟

اس کتاب کی اصل کہانی انہی سوالات کے بدلنے کی کہانی ہے۔ دوستوں، اساتذہ، مطالعے، تنظیمی تربیت، گھریلو زندگی، پیشہ ورانہ تجربات اور دعوتی جدوجہد نے مجھے یہ سکھایا کہ فرد اور معاشرہ الگ دنیا نہیں۔ فرد معاشرے سے بنتا ہے اور معاشرہ افراد سے۔ اسی لیے شعور کا سفر صرف اپنی ذات کو سنوارنے پر ختم نہیں ہوتا؛ وہ انسان کو اپنی ذات، تعلقات اور نظام، تینوں کی ذمہ داری کی طرف لے جاتا ہے۔

یہ ایڈیشن میرے طویل مسودے کو از سر نو ترتیب دے کر تیار کیا گیا ہے۔ تکرار کم کی گئی ہے، ایک ہی موضوع کے منتشر حصے یکجا کیے گئے ہیں، اور اصل واقعات، شخصیات اور بنیادی فکری موڑ محفوظ رکھے گئے ہیں۔ میری خواہش یہ ہے کہ قاری اسے کسی تیار نظریاتی نسخے کے بجائے ایک سیکھنے والے انسان کے سفر کے طور پر پڑھے۔

مصنفانہ وضاحت

یہ کتاب میرے فکری و عملی سفر کے مختلف مراحل کی روداد ہے، کسی حتمی علمی یا فکری موقف کا دعویٰ نہیں۔ اس میں بیان ہونے والے بہت سے خیالات وہ ابتدائی تصورات ہیں جو وقت، مطالعے، تجربے اور اہل علم کی رہنمائی کے ساتھ مسلسل ارتقا پذیر رہے ہیں۔ ممکن ہے بعض تعبیرات نامکمل، قابلِ بحث یا کسی قاری کو مختلف محسوس ہوں۔ انہیں میرے فکری سفر کے اسی مرحلے کے تناظر میں پڑھا جائے۔ اگر کسی مقام پر میری تعبیر درست مفہوم ادا نہ کر سکے تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ میرا مقصد کسی پر اپنی رائے مسلط کرنا نہیں، بلکہ یہ بیان کرنا ہے کہ سوالات نے مجھے کس طرح سوچنے اور آگے بڑھنے پر آمادہ کیا۔

فہرستِ ابواب

ii	 حقوقِ اشاعت
iii	 انتساب
iv	 پیش لفظ
v	 مصنفانہ وضاحت
1	 باب اول
5	 باب دوم
6	 2009ء — تنظیمی ذمہ داری کی طرف پہلا قدم
7	 میڈیکل کالج اور دعوتی جدوجہد
10	 سرکل کلاس — فکر میں مزید گہرائی:
14	 باب سوم
15	 تدبیر منزل کیا ہے؟
17	 غصہ، جذبات اور زبان کی حفاظت
22	 مشاورت ضروری ہے، مگر ہر شخص سے مشاورت ضروری نہیں۔
29	 بچوں کی آمد — تدبیر منزل کا اگلا امتحان
33	 خلیقی حل تلاش کرنا
42	 باب پنجم
43	 وقت بھی ایک سرمایہ ہے۔
49	 باب ششم

50	 نظام کی خرابی اور فرد کی ذمہ داری
59	 باب ہفتم
60	 2۔ سوال پیدا کریں، صرف جواب نہ دیں
61	 4۔ اختلاف سے پہلے مشترکات تلاش کریں
61	 5۔ انسان کو لیبل کے بجائے انسان سمجھنا
65	 دعوت کا اصل حاصل
73	 باب ہشتم
83	 باب نہم
83	 اخلاق، نظام اور اجتماعی تبدیلی
93	 مصنف کے بارے میں

باب اول

سوال سے شعور تک — دوست

زندگی میں بعض دوست صرف دوست نہیں ہوتے؛ وہ انسان کی زندگی میں آنے والے خاموش رہنما ہوتے ہیں۔ اس وقت شاید ہمیں ان کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہوتا۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھتے ہیں، چائے پیتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، کبھی اختلاف کرتے ہیں اور کبھی ان کی کسی بات کو معمولی سمجھ کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن برسوں بعد جب انسان پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کو دیکھتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے فکری سفر کے بعض اہم موڑ انہی محفلوں میں پوشیدہ تھے۔

میری زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ یہ غالباً 2008ء کا زمانہ تھا۔ میں اپنی میڈیکل تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرسبز ہسپتال لاہور میں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ ظاہری طور پر میری زندگی کی سمت واضح تھی: وارڈ، مریض، ڈیوٹیاں، امتحانات اور مستقبل کی پیشہ ورانہ جدوجہد۔ لیکن میرے اندر ایک دوسری دنیا بھی آباد تھی — سوالات کی دنیا۔ میں دین کو صرف چند عبادات یا ذاتی نیکی تک محدود کر کے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے اندر یہ سوال پیدا ہو چکا تھا کہ اگر اسلام ایک مکمل دین ہے تو اس کا تعلق صرف فرد کی اصلاح تک کیوں محدود ہو؟ انسان جس معاشرے میں رہتا ہے، اس کی معیشت، سیاست، تعلیم، سماجی رویے اور باہمی تعلقات — کیا دین کا ان سب سے بھی کوئی تعلق نہیں؟ سوال موجود تھے، مگر ابھی ان کی کوئی مکمل فکری ترتیب نہیں بنی تھی۔

اسی دور میں کچھ دوست میری زندگی میں ایسے آئے جنہوں نے ان منتشر سوالات کو ایک سمت دینا

شروع کی۔ ڈاکٹر رمضان فیصل کے ساتھ رفاقت بھی میرے لیے اسی اعتبار سے اہم رہی۔ ہم طب کے

شعبے سے وابستہ تھے، لیکن ہماری گفتگو صرف مریض، وارڈ، ڈیوٹی اور امتحانات تک محدود نہ رہتی۔

آہستہ آہستہ گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا گیا: دین کیا ہے؟ دعوت کیا ہے؟ ایک مسلمان کی انفرادی ذمہ

داری کہاں ختم ہوتی ہے اور اجتماعی ذمہ داری کہاں سے شروع ہوتی ہے؟

انہی دنوں مجھے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر اور اس علمی روایت سے تعارف حاصل ہوا۔ میرے لیے یہ

محض ایک تاریخی شخصیت کا تعارف نہیں تھا؛ یہ انسان، معاشرے اور اجتماعی نظام کو سمجھنے کے ایک

نئے زاویے کا آغاز تھا۔ اگر فرد نیک ہو، لیکن وہ جس اجتماعی نظام میں زندگی گزار رہا ہو وہ غیر منصفانہ

ہو، تو کیا صرف فرد کی نیکی کافی ہے؟

یہ سوال بظاہر مختصر تھا، لیکن میرے فکری زاویے میں ایک بڑی تبدیلی کی بنیاد بن گیا۔ اب سوال

صرف یہ نہیں رہا تھا کہ میں اپنی ذات کو کیسے بہتر بناؤں؛ سوال یہ بھی تھا کہ ایک اچھا معاشرہ کیسے بنتا

ہے، اور ایک صالح فرد اس کی تشکیل میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔

لاہور کی محفلیں اور ایک نئی جستجو

سروسز ہسپتال کے زمانے میں میرا طبی سفر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی فکری سفر بھی

ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ دوستوں کی محفلوں میں قرآن، سماج، دین، معاشی نظام اور

اجتماعی فکر جیسے موضوعات زیر بحث آنے لگے۔ پہلی مرتبہ میں قرآن کو صرف اپنی انفرادی زندگی کے

آئینے میں نہیں بلکہ انسانی معاشرے کے تناظر میں بھی دیکھنے لگا۔ عدل، ظلم، معاشرتی تعلقات، ریاست، معیشت اور اجتماعی ذمہ داری جیسے سوال مجھے مسلسل اپنی طرف کھینچنے لگے۔ انہی دوستوں، انہی سوالات اور انہی مجلسوں کے راستے ایک نام میری زندگی میں بتدریج اہم ہوتا گیا۔

رحیمہ کا دروازہ:

رحیمہ سے تعلق کسی ایک دن پیش آنے والا واقعہ نہیں تھا۔ پہلے سوال تھے، پھر گفتگو ہوئی، پھر مطالعہ، پھر مجالس، اور آہستہ آہستہ ایک فکری روایت میرے سامنے واضح ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ فرد کی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح ایک دوسرے کی ضد نہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ ایک صالح فرد ایک صالح اجتماعی نظام کی تشکیل میں اپنا کردار کیسے ادا کرے۔

پہلا سوال تھا: میں کون ہوں؟ دوسرا سوال تھا: ہم کون ہیں؟

پہلا سوال مجھے اپنے اندر لے گیا تھا، دوسرا مجھے اجتماعی فکر کی طرف لے آیا۔ یوں رحیمہ کا سفر میرے لیے ”میں“ سے ”ہم“ تک پہنچنے کا سفر بننے لگا۔

میرے شعوری سفر میں حضرت شاہ سعید احمد رائے پورویؒ سے فکری و تربیتی نسبت ایک اہم مرحلہ بنی۔

ان کی زندگی میں قرآن فہمی، اخلاقی و روحانی تربیت، نوجوانوں کی فکری رہنمائی اور دین کے اجتماعی تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش نمایاں تھی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے بدلتے سیاسی اور معاشرتی حالات نے ان کے سامنے بھی یہ سوال نمایاں رکھا کہ دینی تعلیم کو محض چند انفرادی عبادات یا رسمی مذہبی

سرگرمیوں تک محدود رکھنے کے بجائے انسان اور معاشرے کی ہمہ جہت اصلاح سے کیسے جوڑا جائے۔
انہوں نے خصوصاً نوجوانوں کی فکری اور اخلاقی تربیت پر توجہ دی۔ مختلف علاقوں کے نوجوانوں سے
رابطہ، ان کی رہنمائی، مطالعہ کی طرف توجہ اور دین کے اجتماعی تصور سے واقفیت اس جدوجہد کے اہم
پہلو تھے۔ میرے لیے ان کی فکر کا خلاصہ اس تصور میں سمٹتا ہے کہ حقیقی تربیت انسان کو اپنی ذات کی
اصلاح کے ساتھ معاشرے کی اصلاح اور انسانیت کی خدمت کا شعور بھی عطا کرے۔ یہی تصور میرے
لیے انفرادیت سے اجتماعیت کے سفر کو سمجھنے کی ایک اہم بنیاد بنا۔

باب دوم

رفاقت، تربیت اور تنظیم — فکر کو عمل میں ڈھالنا

برسوں بعد جب میں اپنے شعوری سفر کو دیکھتا ہوں تو مجھے صرف کلاسیں، میٹنگز، کتابیں اور پروگرام یاد نہیں آتے؛ مجھے لوگ یاد آتے ہیں۔ وہ دوست جو ساتھ بیٹھے، سوال کیے، اختلاف کیا، سمجھایا، حوصلہ دیا، مشکل میں ساتھ کھڑے ہوئے اور زندگی کے ایک اہم دور میں میرے ہم سفر بنے۔

ڈاکٹر فراست — فکر اور تنظیمی تربیت کے رفیق

ڈاکٹر فراست کے ساتھ رفاقت نے مجھے تنظیمی سرگرمیوں کو زیادہ سنجیدگی، نظم اور عملی زندگی سے جوڑ کر سمجھنے میں مدد دی۔ گفتگو، نشستیں، مشاورت اور مختلف سرگرمیاں میرے لیے محض مصروفیت نہیں تھیں بلکہ سیکھنے کا موقع تھیں۔ بعض اوقات انسان منزل نہیں بدلتا، لیکن ایک اچھا ساتھی اس کے چلنے کا انداز بدل دیتا ہے۔

ڈاکٹر آصف نوید — مشکل وقت کے ساتھی

ڈاکٹر آصف نوید کے ساتھ تعلق نے مجھے یہ سمجھایا کہ حقیقی رفاقت صرف خوشی، علمی گفتگو یا تنظیمی اجلاس میں ساتھ بیٹھنے کا نام نہیں؛ مشکل وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہونے کا نام بھی ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل میں ان کا تعاون، خلوص اور حوصلہ افزائی میرے لیے قابلِ قدر رہی۔

ڈاکٹر محمود — رفاقت، تعاون اور تسلسل

ڈاکٹر محمود بھی اس فکری و تنظیمی سفر کے ان ساتھیوں میں شامل رہے جن کے ساتھ تعلق نے سفر کو آسان اور بامعنی بنایا۔ تنظیمی زندگی میں ہم نظریات اور بڑے مقاصد کی بات کرتے ہیں، لیکن وقت نے مجھے سکھایا کہ بڑے مقاصد کی طرف سفر چھوٹے چھوٹے انسانی تعلقات، باہمی اعتماد، قربانی اور تعاون سے ممکن ہوتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہماری رفاقت میں جو اخلاص، خیر اور خدمت کا جذبہ تھا اسے قبول فرمائے، ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور ہمیں زندگی کے ہر مرحلے میں انسانوں کے لیے خیر کا ذریعہ بنائے۔

کچھ سفر منزلوں کی وجہ سے یاد رہتے ہیں، اور کچھ ان لوگوں کی وجہ سے جو راستے میں ہمارے ساتھ چلتے ہیں۔ میرے شعوری سفر میں بعض واقعات بظاہر بہت معمولی تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ احساس ہوا کہ انہی چھوٹے واقعات نے میری فکر اور زندگی کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 2009ء کے قریب تنظیمی تربیت اور ذمہ داری کا مرحلہ زیادہ باقاعدہ صورت اختیار کرنے لگا۔ معاشرے کی خرابیوں کا شعور پیدا ہو جائے تو اگلا سوال لازماً سامنے آتا ہے: ایک باشعور انسان کی ذمہ داری کیا ہے؟ صرف تنقید کافی نہیں۔ فرد کو اپنی تربیت، مطالعہ، تعلق، دعوت اور عملی ذمہ داری کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

2009ء — تنظیمی ذمہ داری کی طرف پہلا قدم

انیس احمد سجاد اور حافظ عمران صاحب کی دعوت اور رفاقت نے مجھے تنظیمی ذمہ داری کی طرف بڑھنے

کا موقع دیا۔ یہ مرحلہ میرے لیے اس وجہ سے اہم تھا کہ فکر اب صرف گفتگو تک محدود نہیں رہ سکتی تھی؛ اسے باقاعدہ تربیت اور عملی وابستگی میں ڈھلانا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دعوت سے پہلے داعی کی اپنی تربیت ضروری ہے۔ اگر انسان خود کسی فکر کو گہرائی سے نہ سمجھتا ہو، اس کی زندگی میں نظم نہ ہو اور اس کے کردار میں اس فکر کی جھلک موجود نہ ہو تو اس کی گفتگو دیرپا اثر پیدا نہیں کر سکتی۔

منظم تربیت کی رہنمائی میں دعوتی کام کو زیادہ منظم انداز میں سمجھنے کا موقع ملا۔ یہاں معلومات سے شعور کی طرف سفر نمایاں ہوا۔ معلومات انسان کو بتاتی ہیں کہ کیا ہوا؛ شعور یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، کن حالات اور کس نظام نے اسے پیدا کیا، اس کے نتائج کس پر مرتب ہوئے، اور اسے بہتر بنانے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔

میڈیکل کالج اور دعوتی جدوجہد

اس زمانے میں میری طبی تعلیم اور پیشہ ورانہ مصروفیات بھی جاری تھیں۔ میڈیکل زندگی اپنی جگہ demanding تھی: پڑھائی، امتحانات، وارڈز اور مستقبل کی پیشہ ورانہ تیاری۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرا تعلیمی سفر بھی جاری تھا۔ میڈیکل تعلیم مجھے انسانی جسم، بیماری اور علاج سمجھا رہی تھی، جبکہ تنظیمی تربیت مجھے معاشرے، اس کی بیماریوں اور اجتماعی اصلاح کے سوالات سے روشناس کروا رہی تھی۔ ایک طرف میں بیماری کی تشخیص کرنا سیکھ رہا تھا، دوسری طرف میرے اندر یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ معاشرتی بیماریوں کی تشخیص کیسے کی جاتی ہے؟

رفقاء سے استفادہ:

ڈاکٹر حارث، ڈاکٹر احسن، ڈاکٹر آصف نوید اور دوسرے رفقاء کے ساتھ نشستیں، مطالعہ، گفتگو اور عملی سرگرمیاں تربیت کا حصہ بنیں۔ انسان کتاب سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے اور استاد سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے، لیکن ہم سفر ساتھی تربیت کا ایک الگ ذریعہ ہوتے ہیں۔ وہ مشکلات دیکھتے ہیں، اختلاف کرتے ہیں، سوال اٹھاتے ہیں، حوصلہ دیتے ہیں اور بعض اوقات ایسی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں جنہیں انسان خود نہیں دیکھ پاتا۔ یوں استفادہ رفقاء میرے لیے تنظیمی تربیت کا مستقل اصول بن گیا۔

کارنر میٹنگ سے باقاعدہ تربیت تک:

ابتدائی نشستوں اور کارنر میٹنگز میں سوال بنیادی تھے: ہم کیا سمجھتے ہیں؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ معاشرے سے ہمارا تعلق کیا ہے؟ آہستہ آہستہ یہ نشستیں منظم مطالعہ، حلقوں اور تربیتی پروگراموں کی طرف بڑھتی گئیں۔ میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ فکری تبدیلی ہمیشہ کسی بڑے اجتماع سے شروع نہیں ہوتی۔ کبھی ایک چھوٹی سی نشست، ایک سنجیدہ سوال یا چند نوجوانوں کی گفتگو برسوں بعد بڑی تبدیلی کی بنیاد بن جاتی ہے۔

باقاعدہ فکری تربیت کا آغاز:

ابتدائی تنظیمی سرگرمیوں کے بعد فورم کلاس اور پھر سرکل کلاس نے مطالعہ اور فکری تربیت کو زیادہ باقاعدہ شکل دی۔ مختلف موضوعات پر لیکچرز، تربیتی نشستیں اور اساتذہ سے استفادہ میرے لیے اس

مرحلے کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ فورم کلاس کی نشستوں میں عقائد، عبادات، تاریخ، سیرتِ نبوی ﷺ، صحابہ کرام اور خلفائے راشدینؓ کے ادوار جیسے موضوعات کا مطالعہ میرے فکری سفر کا حصہ بنا۔ ان موضوعات کی اہمیت صرف مذہبی معلومات حاصل کرنے میں نہیں تھی، بلکہ یہ جاننے میں بھی تھی کہ دین فرد کی اخلاقی اصلاح کے ساتھ اجتماعی زندگی کے لیے کیا اصول فراہم کرتا ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کو اجتماعی زاویے سے سمجھنا اس تربیتی دور میں سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ میرے لیے ایک نئے زاویے سے سامنے آیا۔ سیرت صرف واقعات کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ دعوت، تربیت، انسان سازی، اجتماعی نظم، صبر، حکمت اور معاشرتی تشکیل کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کا ذریعہ بنی۔

میرے لیے یہ سمجھ اہم تھی کہ فرد کی اصلاح اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اخلاقی انسان سازی، باہمی تعلق، ذمہ داری اور منظم اجتماعی عمل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

قرآن، شعور اور اجتماعی زندگی:

سرکل کلاس کی طرف بڑھتے ہوئے قرآن کے فہم اور اس کے اجتماعی پیغام کو سمجھنے کی کوشش بھی زیادہ گہری ہوئی۔ قرآن کو صرف انفرادی ثواب یا شخصی اصلاح کے حوالے سے پڑھنے کے بجائے یہ سوال سامنے آیا کہ قرآن انسان، معاشرہ، عدل، ظلم، اخلاق اور اجتماعی ذمہ داری کے بارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ یہ میرے شعوری سفر میں ایک اہم تبدیلی تھی۔ دین بتدریج میرے لیے صرف

انفرادی اعمال کا مجموعہ نہیں رہا بلکہ انسانی زندگی کے اخلاقی اور اجتماعی پہلوؤں کو مربوط کرنے والی وسیع رہنمائی کے طور پر سامنے آنے لگا۔

سرکل کلاس — فکر میں مزید گہرائی:

فورم کلاس کے بعد سرکل کلاس میرے تنظیمی اور فکری سفر کا اگلا مرحلہ بنی۔ سرکل کلاس میں موضوعات کی گہرائی بڑھی۔ قرآن کے اجتماعی شعور، انقلاب، ہندوستان کی تاریخی جدوجہد اور دوسرے نظریاتی و تاریخی موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اس مرحلے نے میرے اندر ایک اہم فکری عادت پیدا کی: کسی واقعے کو تنہا نہ دیکھنا بلکہ اسے اس کے تاریخی اور سماجی پس منظر میں سمجھنا۔

ایک مشکل وقت میں رفاقت کا امتحان:

تنظیمی زندگی صرف کلاس روم، کتاب اور نظریاتی گفتگو کا نام نہیں۔ اس کا اصل امتحان انسانی تعلقات اور مشکل حالات میں ہوتا ہے۔ 2009ء کے دوران بیماری اور علاج کے ایک مرحلے نے مجھے رفاقت اور تنظیمی تعلق کی انسانی جہت سے بھی متعارف کروایا۔ میرے ساتھیوں اور رفقاء نے جس طرح میرا ساتھ دیا، وہ میرے لیے بہت معنی رکھتا تھا۔ یہاں تنظیمی رشتہ نظریاتی گفتگو سے نکل کر عملی ہمدردی، تعاون اور خدمت میں تبدیل ہوتا دکھائی دیا۔ اگر ایک جماعت اپنے افراد کو صرف پروگراموں کے لیے جمع کرے، لیکن ان کے دکھ، بیماری اور مشکلات میں شریک نہ ہو تو اس کی اجتماعیت نامکمل رہتی ہے۔ اصل اجتماعیت وہ ہے جہاں فکر کے ساتھ انسان بھی اہم ہو۔

صحت یابی اور دوبارہ سفر:

علاج کے بعد کچھ عرصہ آرام کرنا پڑا۔ اس وقفے نے مجھے اپنے سفر پر غور کرنے کا موقع بھی دیا۔ مسلسل سرگرمی میں انسان کبھی کبھی یہ سوچ نہیں پاتا کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں پہنچ رہا ہے۔ صحت بہتر ہونے کے بعد میں نے دوبارہ تعلیمی اور تنظیمی سرگرمیوں کی طرف واپسی شروع کی۔ یہ واپسی صرف کلاسوں میں دوبارہ شرکت نہیں تھی۔ اب میرے پاس ایک ذاتی تجربہ بھی تھا جس نے مجھے سمجھایا کہ جماعت انسانوں سے بنتی ہے، اور انسانوں کو جوڑنے والی سب سے مضبوط قوت صرف نظریاتی اتفاق نہیں بلکہ اعتماد، اخلاص اور باہمی خیر خواہی بھی ہے۔

استاد، کتاب اور رفیق اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے میرے سامنے تربیت کے تین اہم ذرائع واضح ہونے لگے تھے: استاد، کتاب اور رفیق۔ استاد نے فکر کو سمت دی، کتاب نے فکر کو وسعت دی، اور رفقاء نے اس فکر کو عملی زندگی میں آزمانے کا موقع دیا۔ علم، عمل، فکر اور رفاقت، مطالعہ اور خدمت — یہ سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ یہ سب ایک دم نہیں ہوا۔ شعور کسی ایک لیکچر سے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سوال سے شروع ہوتا ہے، مطالعے سے بڑھتا ہے، استاد کی رہنمائی سے نکھرتا ہے، رفقاء کے ساتھ مکالمے سے پختہ ہوتا ہے اور زندگی کے تجربات اسے حقیقت سے جوڑ دیتے ہیں۔

2009ء کا دور میرے لیے اسی تدریجی تبدیلی کا زمانہ تھا۔ منظم مطالعے نے سوالوں کو ترتیب دی، کلاسوں نے فکر میں گہرائی پیدا کی، اساتذہ نے رہنمائی دی اور رفقاء کے ساتھ تجربات نے اجتماعیت کا

انسانی مفہوم سمجھایا۔ اب میں صرف یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ایک دوسرا

سوال بھی میرے سامنے کھڑا ہو چکا تھا:

میری صلاحیت، میرا علم اور میری زندگی ایک بہتر اجتماعی زندگی کی تشکیل میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

شاید یہی وہ سوال تھا جو آنے والے برسوں میں میرے فکری، پیشہ ورانہ اور سماجی سفر کے مختلف

راستوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے والا تھا۔

آج جب میں تقریباً دو دہائیاں پیچھے دیکھتا ہوں تو سروسز ہسپتال کا وہ نوجوان ڈاکٹر نظر آتا ہے جسے خود

بھی معلوم نہیں تھا کہ دوستوں کے ساتھ ہونے والی بظاہر معمولی گفتگوئیں اسے کہاں لے جائیں گی۔

اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ کچھ سوال اسے بے چین کرتے ہیں۔ میرے اساتذہ نے مجھے کھڑا ہونا

سکھایا۔ میرے دوستوں نے مجھے سوال کرنا سکھایا۔ میرے مربیوں نے ان سوالوں کو فکر میں ڈھالنے

میں مدد دی۔ مطالعے نے دائرہ وسیع کیا، تنظیمی تربیت نے ذمہ داری کا شعور دیا، اور رفاقت نے مجھے بتایا

کہ اجتماعی زندگی محض نظریہ نہیں بلکہ انسانوں کے ساتھ چلنے کا نام ہے۔ اگر علم صرف مجھے بدل دے

تو یہ میری کامیابی ہے؛ لیکن اگر علم مجھے انسانوں کی اجتماعی بھلائی کے لیے کھڑا کر دے، تو شاید وہیں سے

شعور کا حقیقی سفر شروع ہوتا ہے۔ یہ میرے شعوری سفر کا اختتام نہیں تھا۔ دراصل یہ اس طویل سفر کی

بنیاد تھی جس میں طب، تدریس، خاندان، بیرون ملک تجربات، ادارہ سازی، دعوت، تربیت اور سماجی

مشاہدات ایک دوسرے سے جڑتے گئے۔ لیکن اس مرحلے نے ایک بات ہمیشہ کے لیے واضح کر دی:

انسان کی حقیقی کامیابی صرف اپنی ذات میں محدود نہیں رہتی؛ وہ اس وقت زیادہ بامعنی ہوتی ہے جب اس کا علم، کردار اور صلاحیت دوسرے انسانوں اور معاشرے کی بہتری کا ذریعہ بنے۔

باب سوم

گھر—محبت، اختلاف، اعتماد اور نسل کی تربیت

بڑی اجتماعیت کی پہلی درسگاہ اکثر چھوٹا گھر ہوتا ہے۔

میرے شعور کے سفر میں حضرت شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی صحبت اور رہنمائی نے مشاورت، اجتماعیت

اور ذمہ دارانہ فیصلہ سازی کی بنیاد مضبوط کی۔

حضرتؒ کے بعد اس فکری و تربیتی سفر میں جس شخصیت سے مجھے مسلسل رہنمائی، شفقت اور فکری سمت

حاصل ہوئی،

وہ حضرت مولانا مفتی عبدالحق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم ہیں۔

حضرت مفتی عبدالحق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم صاحب میرے لیے محض ایک عالم یا استاد نہیں

بلکہ میرے شعوری سفر کے آخری اور موجودہ مربی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ سعید احمد رائے

پوریؒ کے جانشین کی حیثیت سے ان سے وابستگی نے مجھے شاہ ولی اللہی فکر کو صرف کتابوں اور نظری

مباحث میں نہیں بلکہ زندگی کے عملی معاملات میں سمجھنے کا موقع دیا۔ ان کی گفتگو میں میں نے بارہا یہ

سبق محسوس کیا کہ انسان کی اصلاح کا امتحان صرف درس گاہ، جماعت یا اجتماع میں نہیں ہوتا؛ اس کا سب

سے قریبی اور شاید سب سے مشکل میدان اس کا اپنا گھر ہے۔

تدبیر منزل کیا ہے؟

لفظ تدبیر اپنے اندر غور، منصوبہ بندی، حکمت اور نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرنے کا مفہوم رکھتا ہے، جبکہ منزل یہاں گھر اور خاندان کی اجتماعی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یوں تدبیر منزل میرے لیے صرف گھر کے اخراجات چلانے یا روزمرہ امور سنبھالنے کا نام نہیں رہی، بلکہ یہ سوال بن گئی: میں اپنے گھر کو محبت، عدل، ذمہ داری، مشاورت اور باہمی احترام کے ساتھ کیسے چلا سکتا ہوں؟ ایک شخص باہر کی دنیا میں کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اگر اس کے گھر میں اعتماد، سکون اور ذمہ داری کا نظام نہ ہو تو اس کی اجتماعی شخصیت میں ایک بنیادی خلا باقی رہتا ہے۔

مختلف مزاجوں کو سمجھنے کا فن

میرے ہاتھ سے لکھے ہوئے ان پرانے نوٹس میں ایک اہم خیال محفوظ ہے کہ شادی کے بعد انسان کو مختلف مزاجوں کو سمجھنا پڑتا ہے۔

یہ بات وقت کے ساتھ میرے لیے مزید معنی خیز ہوتی گئی۔

خاندان ایک جیسے لوگوں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ میاں اور بیوی کی تربیت، عادات، جذباتی ضروریات، ترجیحات اور معاملات کو دیکھنے کا انداز مختلف ہو سکتا ہے۔ پھر بچے آتے ہیں تو ہر بچے کا مزاج بھی دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔

تدبیر منزل کا پہلا سبق شاید یہی ہے کہ

گھر چلانے کا مطلب سب کو اپنے جیسا بنانا نہیں، بلکہ مختلف مزاج رکھنے والے انسانوں کے درمیان محبت اور توازن پیدا کرنا ہے۔

یہاں حکم سے زیادہ فہم، اور ردِ عمل سے زیادہ تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

شادی — صرف تعلق نہیں، ایک نئی ذمہ داری

میرے لیے شادی نے زندگی کا ایک بالکل نیا باب کھولا۔ اب میرے فیصلے صرف میری ذات تک محدود نہیں تھے۔ وقت، مالی وسائل، پیشہ ورانہ ترجیحات، خاندانوں کے تعلقات اور مستقبل کے منصوبے —

ہر چیز میں ایک دوسرے انسان کا حق شامل ہو گیا تھا۔ یہیں مجھے احساس ہوا کہ شادی دراصل "میں" سے

"ہم" کی طرف ایک عملی سفر ہے۔ جس اجتماعیت کو میں تنظیمی کلاسوں میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی پہلی عملی تجربہ گاہ میرا اپنا گھر بنے لگا۔

اگر میں اجتماعیت، عدل، مشاورت اور احترام کی بات کرتا ہوں تو ان اصولوں کا پہلا امتحان میرے قریب ترین تعلقات میں ہونا چاہیے۔

میرے نوٹس میں ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والے اختلافات اور انہیں سمجھنے کی کوشش کا ذکر بھی موجود ہے۔

وقت نے مجھے سکھایا کہ اختلاف کا موجود ہونا بذاتِ خود تعلق کی ناکامی نہیں ہے۔ دو انسان ساتھ رہیں گے تو رائے، ترجیح اور توقع میں فرق لازماً سامنے آئے گا۔ اصل سوال یہ ہے کہ اختلاف کے وقت ہمارا رویہ کیا ہوتا ہے۔

کیا ہم دوسرے کو شکست دینا چاہتے ہیں یا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں؟
کیا ہم غصے کے لمحے میں فیصلہ کرتے ہیں یا مناسب وقت پر گفتگو کرتے ہیں؟
کیا ہم صرف اپنا موقف دہراتے ہیں یا دوسرے کی بات بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؟
تدبیر منزل نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ گھر میں ہر بحث جیتنا کامیابی نہیں؛ بعض اوقات تعلق کو محفوظ رکھنا زیادہ بڑی کامیابی ہے۔

مشاورت — گھر کے نظام کی بنیاد

حضرت شاہ سعید احمد رائے پوریؒ سے حاصل ہونے والا مشاورت کا سبق گھریلو زندگی میں اور زیادہ عملی ہو گیا۔ گھر کے اہم فیصلوں میں شریکِ حیات کو اعتماد میں لینا، بچوں سے متعلق معاملات میں باہمی رائے قائم کرنا، مالی ترجیحات پر گفتگو کرنا اور ضرورت پڑنے پر کسی مخلص اور صاحبِ تجربہ شخص سے رہنمائی لینا — یہ سب تدبیر منزل کا حصہ ہیں۔

میں نے یہ سمجھا کہ مشاورت کا مطلب فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھودینا نہیں، بلکہ اپنی محدود بصیرت کو دوسرے انسان کی بصیرت سے وسیع کرنا ہے۔

غصہ، جذبات اور زبان کی حفاظت

خاندانی زندگی میں ایک اور بڑی تربیت اپنے جذبات کو منظم کرنا ہے۔

انسان باہر کے لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے اکثر الفاظ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرتا ہے، لیکن گھر میں قربت کی وجہ سے یہی احتیاط کم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ بعض اوقات غصے میں کہا گیا ایک جملہ دیر تک دل میں باقی رہتا ہے۔

میں نے اپنے سفر میں یہ سیکھا کہ مسئلہ پیدا ہونے کے وقت فوراً رد عمل دینے کے بجائے کچھ وقت دینا، دوسرے کا موقف سننا اور گفتگو کے لیے مناسب لمحہ تلاش کرنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔

یہاں تدبیر منزل دراصل اپنے نفس کی تدبیر بھی بن جاتی ہے۔

جو شخص خود اپنے غصے، انا اور خواہش کو منظم نہیں کر سکتا، اس کے لیے دوسروں کے ساتھ ایک پرسکون نظام قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میرے نوٹس میں مشکل معاملات میں دوستوں سے مشورے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میرے شعوری سفر میں مخلص رفقاء ہمیشہ ایک قیمتی سرمایہ رہے ہیں۔

تاہم وقت نے یہ بھی سکھایا کہ گھریلو مسئلہ ہر شخص کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے۔ مشورہ اسی شخص سے مفید ہوتا ہے جو رازدار ہو، دونوں فریقوں کی عزت کا خیال رکھتا ہو، جذبات کو مزید بھڑکانے کے بجائے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرے اور جس کے پاس زندگی کا مناسب تجربہ ہو۔

اسی لیے مربی، استاد اور چند قابل اعتماد رفقاء کی موجودگی زندگی میں ایک نعمت ہے۔

حضرت مفتی عبدالحق آزاد رائے پوری صاحب سے سیکھا ہوا تسلسل

حضرت مفتی عبدالحق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم کی تربیت نے میرے لیے اس پورے تصور کو مزید وسیع کیا۔ فرد، خاندان اور معاشرہ الگ الگ جزیرے نہیں ہیں۔

اچھا معاشرہ اچھے انسانوں سے بنتا ہے، اور انسان کی پہلی اجتماعی تربیت گھر میں ہوتی ہے۔ اگر گھر میں

عدل، ذمہ داری، محبت، احترام، مشاورت اور خدمت کا مزاج پیدا ہو تو یہی اقدار انسان اپنے پیشے اور

معاشرتی تعلقات میں بھی لے کر جاتا ہے۔

اس لحاظ سے تدبیر منزل محض گھریلو انتظام نہیں بلکہ اجتماعی تربیت کی پہلی درس گاہ ہے۔

تدبیر منزل سے تدبیر معاشرہ تک

میرے شعور کے سفر میں اب ایک دلچسپ ربط سامنے آنے لگا تھا۔

میں معاشرے میں اجتماعیت کی بات کر رہا تھا، لیکن اجتماعیت کا پہلا سبق گھر میں تھا۔ میں مشاورت کی

اہمیت سیکھ رہا تھا، مگر اس کا پہلا عملی میدان خاندان تھا۔

میں عدل کے اجتماعی نظام کا مطالعہ کر رہا تھا، مگر عدل کا پہلا امتحان اپنے قریبی انسانوں کے حقوق میں تھا۔

میں انسان سازی کی بات کر رہا تھا، مگر اپنی اور اپنی اولاد کی تربیت اس کا سب سے قریبی میدان

تھی۔ یہاں مجھے محسوس ہوا کہ تدبیر منزل دراصل میرے "انفرادیت سے اجتماعیت" کے سفر کی ایک

بنیادی کڑی ہے۔

تنظیم نے مجھے لوگوں کے ساتھ چلنا سکھایا، مشاورت نے دوسروں کی دانش سے فائدہ اٹھانا سکھایا، اور

خاندان نے مجھے یہ سکھایا کہ ان اصولوں کو روزمرہ زندگی میں نبھانا کتنا اہم اور کتنا مشکل ہے۔

حضرت شاہ سعید احمد رائے پوریؒ سے حاصل ہونے والی مشاورت کی روایت اور حضرت مولانا مفتی

عبدالحق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم کی فکری و تربیتی رہنمائی نے میرے سامنے اس حقیقت کو مزید

واضح کیا کہ:

معاشرے کی اصلاح کا خواب گھر کی ذمہ داری سے الگ نہیں ہو سکتا۔ جو انسان دنیا کو بہتر بنانا چاہتا ہے،

اسے اپنے گھر میں محبت، عدل، مشاورت اور ذمہ داری کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

حضرت مولانا مفتی عبدالحق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم کی تربیتی رہنمائی میں تدبیر منزل کے تصور

کو سمجھتے ہوئے مجھے بتدریج یہ احساس ہوا کہ خاندان کو سنبھالنا محض معاشی کفالت یا انتظامی ذمہ داری کا

نام نہیں۔ گھر دراصل انسان کے اخلاق، صبر، برداشت، ایثار، گفتگو اور اپنی انا پر قابو پانے کی سب سے

قریبی تربیت گاہ ہے۔

میرے 2013ء کے یہ ذاتی نوٹس اس دور کی اندرونی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ شادی کے ابتدائی

عرصے میں ایک نئی زندگی کو سمجھنے، دو مختلف مزاجوں کو قریب لانے اور اختلاف کے باوجود تعلق کو

مضبوط رکھنے کی جدوجہد واضح نظر آتی ہے۔

شادی سے پہلے انسان ازدواجی زندگی کا ایک تصور اپنے ذہن میں بناتا ہے، لیکن شادی کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی زندگی تصورات سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور خوب صورت دونوں ہو سکتی ہے۔ دو انسان مختلف خاندانوں، مختلف تربیت، مختلف عادات اور مختلف توقعات کے ساتھ ایک گھر میں زندگی شروع کرتے ہیں۔ فطری طور پر ہر معاملے میں یکساں سوچ پیدا نہیں ہو سکتی۔

میرے نوٹس میں بھی بار بار اختلاف، سمجھنے، سمجھانے، برداشت کرنے اور compromise کا ذکر ملتا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ میں خود بھی ایک نئے تعلق کو سمجھنے اور اپنی شخصیت کو اس کے مطابق ڈھالنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

بعد میں مجھے احساس ہوا کہ ازدواجی زندگی کا مقصد اختلاف کو مکمل طور پر ختم کرنا نہیں، بلکہ اختلاف کے باوجود محبت اور احترام کے ساتھ جینا سیکھنا ہے۔

میرے ان نوٹس میں ایک دلچسپ جگہ پر Logic کا لفظ نمایاں ہے۔ یہ میرے لیے بعد میں ایک اہم سبق بن گیا۔

پیشہ ورانہ اور علمی زندگی میں ہم دلیل سے مسئلہ حل کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کے طور پر بھی میری تربیت یہی تھی: مسئلہ تلاش کرو، وجوہات سمجھو، شواہد دیکھو اور پھر منطقی حل نکالو۔ لیکن انسانی تعلقات کو دلیل سے زیادہ توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ کبھی حل سے پہلے اسے سنا جانا ضروری ہوتا ہے۔

کبھی صحیح بات بھی غلط وقت پر کہی جائے تو مسئلہ بڑھ جاتا ہے۔ اور کبھی اپنی بات درست ہونے کے باوجود تعلق کی خاطر خاموشی زیادہ حکیمانہ ہوتی ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سمجھا کہ گھر عدالت نہیں جہاں ہر اختلاف کا فیصلہ یہ ثابت کر کے کیا جائے کہ کون صحیح اور کون غلط ہے؛ گھر ایک تعلق ہے جسے محبت، حکمت اور برداشت سے محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔

میرے نوٹس میں compromise کا لفظ بھی موجود ہے۔ ازدواجی زندگی کے ابتدائی تجربات میں شاید

یہ تصور مجھے اپنی خواہش سے پیچھے ہٹنے کے مترادف محسوس ہوتا ہو، لیکن وقت نے اس کے معنی بدل دیے۔ صحت مند مفاہمت کا مطلب اپنی شخصیت، اصول یا عزت نفس ختم کرنا نہیں۔ اس کا مطلب یہ سمجھنا ہے کہ مشترکہ زندگی میں ہمیشہ میری خواہش ہی آخری فیصلہ نہیں ہو سکتی۔

کبھی میں ایک قدم پیچھے ہٹوں، کبھی دوسرا شخص؛ کبھی دونوں اپنی پہلی رائے میں تبدیلی لائیں اور کوئی تیسرا راستہ تلاش کریں۔

یہی "میں" سے "ہم" کی عملی تربیت ہے۔

میرے نوٹس میں grooming کا تصور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ابتدا میں انسان اکثر یہ سوچتا ہے کہ سامنے والے کی کون سی عادت تبدیل ہونی چاہیے۔ مگر تدبیر منزل کا زیادہ گہرا سبق یہ ہے کہ سوال کا آغاز خود سے کیا جائے:

مجھے اپنے اندر کیا بدلنے کی ضرورت ہے؟

کیا میں اچھا سامع ہوں؟

کیا غصے میں اپنی زبان پر قابو رکھتا ہوں؟

کیا میں دوسرے کی ضروریات کو اپنی ضروریات جتنی اہمیت دیتا ہوں؟

کیا میں اپنی غلطی تسلیم کر سکتا ہوں؟

کیا اختلاف کے بعد پہل کر کے تعلق بحال کر سکتا ہوں؟

یہ سوال آسان نہیں تھے۔

لیکن مجھے محسوس ہوا کہ گھر کی اصلاح کا سب سے قابل عمل نقطہ آغاز دوسرے انسان کی اصلاح نہیں بلکہ اپنی تربیت ہے۔

قربانی—خاندانی زندگی کی خاموش قوت

ازدواجی زندگی میں ایک اور لفظ بار بار اپنے معنی واضح کرتا گیا: قربانی۔

خاندان میں بہت سی قربانیاں کسی کو دکھائی نہیں دیتیں۔ وقت کی قربانی، نیند کی قربانی، ذاتی خواہشات کی قربانی، مالی ترجیحات میں تبدیلی اور کبھی اپنے منصوبے کو دوسرے کی ضرورت کے لیے مؤخر کرنا۔ اگر دونوں طرف یہ جذبہ موجود ہو تو گھر محض مشترکہ رہائش نہیں رہتا بلکہ باہمی خیر خواہی کا رشتہ بن جاتا ہے۔ لیکن قربانی کو یک طرفہ مطالبہ نہیں بننا چاہیے۔ حقیقی تدبیر منزل میں حقوق اور ذمہ داریاں دونوں موجود ہیں۔ محبت کا مطلب نا انصافی قبول کرنا نہیں، بلکہ باہمی احترام کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی مسلسل کوشش ہے۔

گھر کے اختلاف کو باہر لے جانے میں احتیاط

میرے نوٹس میں گھر کے معاملات، دوستوں اور مشورے کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔ وقت کے ساتھ میں نے اس بارے میں ایک اہم فرق سمجھا۔

مشاورت ضروری ہے، مگر ہر شخص سے مشاورت ضروری نہیں۔

ازدواجی زندگی کے ہر چھوٹے اختلاف کو دوستوں اور رشتہ داروں میں بیان کرنا بعض اوقات مسئلے کو

حل کرنے کے بجائے پیچیدہ کر سکتا ہے۔ وقتی ناراضی ختم ہو جاتی ہے لیکن دوسروں کے ذہن میں پیدا

ہونے والا منفی تاثر باقی رہ سکتا ہے۔

اس لیے اگر کسی معاملے میں بیرونی رہنمائی ضروری ہو تو ایسے رازدار، غیر جانب دار، سمجھ دار اور خیر خواہ

مرہی سے مشورہ بہتر ہے جو تعلق توڑنے کے بجائے اسے صحت مند بنانے میں مدد کرے۔

یہیں مجھے اپنے اساتذہ اور مربیوں کی موجودگی کی قدر مزید محسوس ہوئی۔

نوجوانی میں محبت کو زیادہ تر ایک جذبے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ازدواجی زندگی نے مجھے محبت کا دوسرا

منہوم سکھانا شروع کیا:

محبت ایک ذمہ داری بھی ہے۔

محبت یہ ہے کہ دوسرے کی کمزوری جاننے کے بعد بھی اس کی عزت محفوظ رکھی جائے۔

محبت یہ ہے کہ غصے میں وہ الفاظ نہ کہے جائیں جن کا زخم بعد میں معافی سے بھی مکمل طور پر نہ بھر سکے۔

محبت یہ ہے کہ مشکل وقت میں مسئلے کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا ہوا جائے، ایک

دوسرے کے مقابل نہیں۔

اور محبت یہ بھی ہے کہ انسان اپنی خامیوں کو پہچاننے اور بدلنے کے لیے تیار رہے۔

تدبیر منزل کا اصل مرکز: اپنی تدبیر

اس پورے تجربے سے میرے سامنے ایک بہت اہم حقیقت آئی

گھر کو سنبھالنے سے پہلے انسان کو خود کو سنبھالنا سیکھنا پڑتا ہے۔

اپنی زبان کی تدبیر،

اپنے غصے کی تدبیر،

اپنے وقت کی تدبیر،

اپنی خواہشات کی تدبیر،

اپنے مالی معاملات کی تدبیر،

اور سب سے بڑھ کر اپنی انا کی تدبیر۔

یہیں تدبیر منزل اور میری تنظیمی تربیت ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

جس اجتماعیت کا سبق میں جماعت میں سیکھ رہا تھا، وہ گھر میں عملی امتحان بن گئی۔ جس مشاورت کا سبق

حضرت شاہ سعید احمد رائے پوری سے حاصل ہوا اور جس تربیتی تسلسل کو حضرت مولانا مفتی عبدالحق

آزاد رائے پوری دامت برکاتہم کی رہنمائی میں سمجھنے کا موقع ملا، اس کی ضرورت مجھے اپنی ذاتی زندگی میں

بھی محسوس ہونے لگی۔

میرے شعور کے سفر میں گھر کوئی الگ باب نہیں تھا۔

یہ شاید سب سے اہم تربیت گاہوں میں سے ایک تھا۔

کیونکہ باہر انسان اپنے بہترین رویے کا انتخاب کچھ گھنٹوں کے لیے کر سکتا ہے، مگر گھر وہ جگہ ہے جہاں

اس کے اصل صبر، اخلاق، برداشت، انصاف اور محبت کا امتحان روز ہوتا ہے۔

اور میں نے تدبیر منزل سے یہی سیکھنا شروع کیا کہ کامیاب خاندان وہ نہیں جس میں کبھی اختلاف نہ ہو،

بلکہ وہ ہے جس میں اختلاف کے باوجود مکالمہ باقی رہے، عزت محفوظ رہے، محبت زندہ رہے اور دونوں

انسان ایک دوسرے کے ساتھ بڑھتے اور سیکھتے رہیں۔

تدبیر منزل کے سفر میں مجھے رفتہ رفتہ یہ سمجھ آنے لگی کہ گھر کے مسائل صرف انتظامی نہیں ہوتے۔ ان

کی جڑ اکثر انسانی نفسیات، جذبات، توقعات، خوف اور تعلق کے بارے میں ہمارے اپنے تصورات میں

ہوتی ہے۔ میرے ان پرانے نوٹس میں بھی یہی کشمکش نمایاں ہے۔ ایک طرف محبت اور قربت کی شدید

خواہش ہے، دوسری طرف یہ سوال کہ محبت میں آزادی، اعتماد اور انفرادی شخصیت کی جگہ کہاں ہے۔

وقت کے ساتھ میرے سامنے یہ حقیقت زیادہ واضح ہوئی کہ محبت اور ملکیت ایک چیز نہیں ہیں۔

ازدواجی زندگی میں قربت فطری ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اس کا شریک حیات اسے سمجھے، اس کے ساتھ

وقت گزارے، اس کی ترجیحات کا خیال رکھے اور جذباتی طور پر اس کے قریب رہے۔ لیکن اگر یہی

خواہش دوسرے انسان کو مسلسل قابو میں رکھنے کی کوشش میں تبدیل ہو جائے تو محبت کا حسن متاثر

ہونے لگتا ہے۔

میرے نوٹس میں بھی اس سوال کی بازگشت ملتی ہے کہ دوسرے انسان کو کتنی آزادی دینی چاہیے۔ بعد کے تجربات نے مجھے سکھایا کہ شاید سوال ہی کچھ مختلف ہونا چاہیے۔ آزادی کوئی ایسی چیز نہیں جو ایک شریکِ حیات دوسرے کو بطور احسان دے۔ دونوں اپنی الگ شخصیت، عزت، رائے اور جائز ذاتی حدود رکھنے والے انسان ہیں۔ ازدواجی تعلق ان آزادیوں کو ختم نہیں کرتا بلکہ انہیں مشترکہ ذمہ داری اور باہمی اعتماد کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔

محبت کا مقصد کسی انسان کو اپنے گرد محدود کرنا نہیں، بلکہ ایسا محفوظ تعلق پیدا کرنا ہے جس میں دونوں انسان اپنی شخصیت کے ساتھ پروان چڑھ سکیں۔

ازدواجی زندگی میں ایک اہم سبق یہ بھی ملا کہ ہر اختلاف کو تعلق کے خلاف فیصلہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ کبھی ایک شخص زیادہ بات کرنا چاہتا ہے اور دوسرا کچھ وقت خاموش رہنا چاہتا ہے۔ ایک فرد سماجی میل جول پسند کرتا ہے اور دوسرا محدود حلقے میں زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ ایک شخص جذبات فوراً بیان کر دیتا ہے جبکہ دوسرے کو اپنے احساسات سمجھنے اور بیان کرنے میں وقت لگتا ہے۔

یہ فرق لازماً محبت کی کمی کی علامت نہیں۔

تدبیرِ منزل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مزاج کے فرق اور تعلق کی خرابی میں فرق کرنا سیکھیں۔ رشتے میں ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ضروری نہیں اور نہ ہی زیادہ فاصلہ صحت مند ہے۔ ایک متوازن ازدواجی تعلق میں قربت بھی ہوتی ہے اور شخصی گنجائش بھی۔

ساتھ بیٹھنا ضروری ہے، مگر کبھی تنہا سوچنے کا وقت بھی ضروری ہے۔

مشتز کہ سرگرمیاں ضروری ہیں، مگر انفرادی دلچسپیاں بھی اپنی جگہ رکھتی ہیں۔

ایک دوسرے سے مشورہ ضروری ہے، مگر ہر چھوٹے فیصلے پر نگرانی ضروری نہیں۔ یہ توازن آسان

نہیں۔ اسے وقت، تجربے اور مسلسل مکالمے سے سیکھنا پڑتا ہے۔

عج ذبائی ذہانت — Emotional Intelligence

میرے ان نوٹس میں Emotional کا لفظ بھی نمایاں ہے۔ آج انہیں دوبارہ پڑھتے ہوئے مجھے محسوس

ہوتا ہے کہ میں اس وقت دراصل اس چیز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جسے آج ہم جذباتی ذہانت

(Emotional Intelligence) کہتے ہیں۔ خاندان میں صرف یہ جاننا کافی نہیں کہ میں کیا محسوس

کر رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی سمجھنا ہوتا ہے کہ:

میرا شریک حیات کیا محسوس کر رہا ہے؟

اس احساس کے پیچھے کیا ضرورت یا خوف ہو سکتا ہے؟

میرے الفاظ دوسرے پر کیا اثر ڈال رہے ہیں؟

اور کیا میں جذبات کی شدت میں فوری فیصلہ کرنے کے بجائے انہیں سمجھنے کے لیے کچھ وقت دے سکتا

ہوں؟

یہ صلاحیت میرے لیے تدبیر منزل کا ایک بنیادی حصہ بنتی گئی۔

غصے میں فیصلہ نہیں

میرے پرانے نوٹس میں غصے اور جذباتی کیفیت میں پیدا ہونے والی کشمکش بھی جھلکتی ہے۔ وقت کے ساتھ اس حوالے سے ایک اصول بہت واضح ہوا: شدید جذبات کے لمحے میں مستقل فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

غصہ آئے تو گفتگو کچھ دیر کے لیے روک دینا شکست نہیں۔ کبھی چند منٹ، کبھی چند گھنٹے اور بعض حالات میں ایک رات کا وقفہ انسان کو وہ بات کہنے سے بچا سکتا ہے جس کا زخم برسوں باقی رہ جائے۔ وقفہ لینے کا مقصد دوسرے کو سزا دینا نہیں بلکہ اپنے جذبات کو منظم کر کے بہتر گفتگو کی طرف واپس آنا ہونا چاہیے۔

توقعات کا بوجھ

ازدواجی تعلق میں بہت سی مایوسیاں ان توقعات سے پیدا ہوتی ہیں جنہیں ہم نے کبھی واضح طور پر بیان ہی نہیں کیا ہوتا۔

ہم ذہن میں ایک تصویر بنالیتے ہیں کہ شریک حیات کو ایسا ہونا چاہیے، اسے یہ سمجھ جانا چاہیے، اسے خود معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کیا چاہیے۔

پھر جب حقیقت اس تصویر سے مختلف نکلتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سامنے والا ہمیں سمجھ نہیں رہا۔

میں نے سیکھا کہ غیر بیان شدہ توقعات اکثر خاموش تنازعات پیدا کرتی ہیں۔

اس کا بہتر راستہ گفتگو ہے۔ الزام کے بغیر اپنی ضرورت بیان کرنا، دوسرے کی توقع سننا اور پھر حقیقت

پسندانہ درمیانی راستہ تلاش کرنا۔

انا۔ گھر کا خاموش دشمن

تدبیر منزل کی تربیت مجھے بار بار اپنی ذات کی طرف واپس لے آئی۔

کبھی اصل مسئلہ وہ نہیں ہوتا جس پر بحث ہو رہی ہوتی ہے؛ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی

اپنی بات سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا۔

انا انسان کو مسئلہ حل کرنے کے بجائے اپنی برتری ثابت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ

ازدواجی زندگی میں بعض چھوٹے جملے بڑی طاقت رکھتے ہیں:

"شاید میں غلط سمجھا۔"

"آپ مجھے اپنا نقطہ نظر سمجھائیں۔"

"اس بات سے آپ کو تکلیف ہوئی، مجھے اس کا احساس ہے۔"

"ہم دونوں مل کر اس کا حل نکالتے ہیں۔"

یہ جملے انسان کو چھوٹا نہیں کرتے؛ بلکہ تعلق کو بڑا کر دیتے ہیں۔

بچوں کی آمد—تدبیر منزل کا اگلا امتحان

خاندان کا نظام میاں بیوی تک محدود نہیں رہتا۔ بچوں کی آمد کے ساتھ ذمہ داری کا دائرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اب ہمارے اختلافات، گفتگو کا انداز، غصہ، محبت اور باہمی احترام صرف ہم دونوں کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ایک نئی نسل انہیں دیکھ اور سیکھ رہی ہوتی ہے۔

یہ احساس میرے لیے بہت اہم بنا کہ بچے ہماری نصیحت سے کم اور ہمارے تعلق کو دیکھ کر زیادہ سیکھتے ہیں۔

اگر وہ گھر میں احترام دیکھیں گے تو احترام سیکھیں گے۔

اگر اختلاف کے باوجود مکالمہ دیکھیں گے تو اختلاف سنبھالنا سیکھیں گے۔

اگر معافی مانگتے والدین دیکھیں گے تو اپنی غلطی قبول کرنا سیکھیں گے۔

یوں تدبیر منزل دراصل تربیتِ نسل بھی ہے۔

میرا شعوری سفر صرف علمی، فکری اور پیشہ ورانہ تبدیلیوں کی داستان نہیں، بلکہ اس کا ایک نہایت اہم حصہ اپنے گھر، اپنے رویوں اور اپنے قریبی رشتوں کو سمجھنے کا سفر بھی ہے۔ انسان باہر کی دنیا میں بڑے بڑے مسائل حل کرنا سیکھ لیتا ہے، مگر بعض اوقات اپنے گھر کے اندر ایک معمولی غلط فہمی کو سلجھانا اس کے لیے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوتا ہے۔

ازدواجی زندگی نے مجھے یہ سبق دیا کہ گھر میں پیدا ہونے والے بہت سے اختلافات دراصل کسی بڑی

دشمنی یا بنیادی اختلاف کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ اکثر ان کے پیچھے غلط فہمی، جذباتی کیفیت، ایک دوسرے کی بات پوری طرح نہ سننا، یا اپنی بات کو درست انداز میں بیان نہ کر پانا ہوتا ہے۔

غلط فہمی — رشتوں کا خاموش امتحان

میں نے اپنے تجربات پر غور کرتے ہوئے محسوس کیا کہ غلط فہمی پیدا ہونے کے چند بنیادی اسباب بار بار سامنے آتے ہیں۔

پہلا سبب یہ کہ انسان کبھی اپنی موجودہ کیفیت اور موڈ کے زیر اثر دوسرے کی بات کا مطلب اخذ کرتا ہے۔ ایک معمولی جملہ، جو عام حالات میں شاید کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو، ذہنی دباؤ یا جذباتی کیفیت میں بہت بڑا محسوس ہونے لگتا ہے۔

دوسرا سبب صرف اپنا الزام یا اعتراض بیان کرنا اور دوسرے کے موقف کو پوری طرح نہ سننا ہے۔ جب گفتگو کا مقصد حقیقت سمجھنے کے بجائے اپنی بات ثابت کرنا بن جائے تو دونوں طرف دفاعی رویہ پیدا ہونے لگتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کبھی حال اور مستقبل کی بجائے ماضی کے واقعات کو کھینچ کر موجودہ اختلاف میں شامل کر لیتے ہیں۔ یوں ایک چھوٹا سا مسئلہ اپنے ساتھ کئی پرانی شکایات کا بوجھ اٹھالیتا ہے۔

مجھے سمجھ آیا کہ ہر اختلاف میں سب سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ:

ہم مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں یا ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

یہ دونوں بالکل مختلف راستے ہیں۔

غصے میں مسئلہ حل نہیں ہوتا

گھریلو اختلاف میں ایک بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ انسان اسی وقت فیصلہ کن گفتگو کرنا چاہتا ہے جب

جذبات اپنے عروج پر ہوں۔

میں نے اپنے لیے ایک اصول اخذ کیا

جب غصہ زیادہ ہو تو مسئلہ حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

اس وقت انسان مسئلے سے زیادہ اپنے جذبات کا دفاع کر رہا ہوتا ہے۔ الفاظ سخت ہو جاتے ہیں، لہجہ بدل

جاتا ہے اور بعض اوقات ایسی بات بھی زبان سے نکل جاتی ہے جس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں

ہوتا۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کچھ وقت دیا جائے۔ ذہن اور جذبات کو معمول پر آنے دیا جائے، پھر

مناسب وقت پر گفتگو کی جائے۔ خاموشی کا یہ وقفہ سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے آپ پر قابو پانے

کے لیے ہونا چاہیے۔

ازدواجی گفتگو کے تین اصول

اپنی تحریری سوچ اور تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے گھریلو اختلاف کو حل کرنے کے لیے تین

بنیادی اصول اخذ کیے۔

پہلا: موجودہ مسئلے تک محدود رہنا۔ جو بات آج پیش آئی ہے، گفتگو اسی کے بارے میں ہو۔ برسوں

پرانے واقعات اور شکایات کو ہر نئے اختلاف کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔

دوسرا: صرف الزام نہیں، حل تلاش کرنا۔ بات چیت کا مرکز یہ نہ ہو کہ ”غلطی کس کی تھی؟“ بلکہ یہ ہو کہ ”ہم آئندہ اسے بہتر کیسے کر سکتے ہیں؟“

تیسرا: دوسرے کا موقف سمجھنا۔ اپنا موقف بیان کرنے سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ دوسرا شخص اس واقعے کو کس زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ کئی مرتبہ ہم دونوں ایک ہی واقعے کو مختلف تجربات اور جذبات کے ساتھ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

اختلاف کو بڑھنے سے پہلے روکنا

میرے نوٹس میں ایک اہم خیال یہ بھی سامنے آیا کہ مسئلے کو اتنا نہ بڑھنے دیا جائے کہ وہ انسان پر overwhelm بن جائے۔

گھریلو مسائل جب جمع ہوتے رہیں تو ایک مرحلے پر انسان اصل مسئلے اور اس کے ساتھ جمع ہونے والے جذبات میں فرق نہیں کر پاتا۔ پھر معمولی بات بھی بہت بڑی محسوس ہونے لگتی ہے۔

اس لیے مسئلہ چھوٹا ہو تو اسے احترام، سکون اور وضاحت کے ساتھ حل کرنا زیادہ آسان ہے۔

لیکن اس کے لیے بھی صحیح وقت کا انتخاب ضروری ہے۔ ہر مسئلہ اسی لمحے حل کرنا ضروری نہیں، مگر ہر اہم مسئلے کو مسلسل دبائے رکھنا بھی درست حکمت عملی نہیں۔

ت

خلیقی حل تلاش کرنا

ازدواجی زندگی میں ہر مسئلے کا حل یہ نہیں کہ ایک شخص مکمل طور پر صحیح اور دوسرا مکمل طور پر غلط ثابت ہو۔

بعض اوقات ضرورت ہوتی ہے کہ ہم creative solution تلاش کریں۔

یعنی ایسا تیسرا راستہ جو دونوں کی ضروریات اور احساسات کو کسی حد تک جگہ دے۔ کبھی وقت تبدیل کیا جاسکتا ہے، کبھی ذمہ داری تقسیم کی جاسکتی ہے، کبھی توقعات واضح کی جاسکتی ہیں، اور کبھی صرف ایک دوسرے کی بات مکمل توجہ سے سن لینا ہی آدھا مسئلہ ختم کر دیتا ہے۔

یہ سوچ میرے لیے اہم بنی

رشتہ جیتنا، دلیل جیتنے سے زیادہ اہم ہے۔

لوگوں کے سامنے اختلاف نہیں

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میاں بیوی کے باہمی اختلاف کو حتی الامکان دوسروں کے سامنے بحث کا

موضوع نہیں بنانا چاہیے۔

لوگوں کے سامنے انسان فطری طور پر اپنا دفاع زیادہ کرتا ہے۔ پھر گفتگو مسئلے کے حل کے بجائے عزت

نفس اور اپنی پوزیشن بچانے کی طرف چلی جاتی ہے۔

اسی طرح اختلاف کے دوران طنز، تحقیر اور شخصیت پر حملے سے اجتناب ضروری ہے۔ اختلاف کسی عمل یا

رویے سے ہو سکتا ہے، پورے انسان سے نہیں۔“ یہ بات مجھے تکلیف دیتی ہے ”کہنا اور“ تم ہمیشہ ایسے ہی ہو ” کہنا بظاہر دو جملے ہیں، لیکن رشتے پر ان دونوں کے اثرات بالکل مختلف ہیں۔

دلیل کی جنگ سے اجتناب

ایک اور اہم سبق یہ تھا کہ بعض اوقات ہم گفتگو شروع تو مسئلہ حل کرنے کے لیے کرتے ہیں لیکن چند منٹ بعد وہ argument بن جاتی ہے۔

پھر ہر شخص نئی دلیل تلاش کرتا ہے، پرانے واقعات یاد کرتا ہے اور اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقع پر رک جانا زیادہ دانش مندی ہے۔

ہر دلیل کا جواب دینا ضروری نہیں۔

ہر غلط فہمی اسی لمحے دور کرنا ضروری نہیں۔

اور ہر اختلاف میں کسی ایک فریق کا فاتح قرار پانا بھی ضروری نہیں۔

کبھی ایک نرم جملہ، کبھی خاموشی، کبھی معذرت اور کبھی صرف یہ کہنا کہ:

”میں آپ کی بات سمجھنا چاہتا ہوں“

ایک طویل بحث سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

گھر کو بہتر بنانے سے پہلے گھر کے انسانوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

باب چہارم

زندگی کے چار ستون — خاندان، پیشہ، سماجی ذمہ داریاں، ذات:

تدبیر منزل کے سفر میں ایک مرحلہ ایسا آیا جب مجھے محسوس ہوا کہ خاندانی زندگی کے مسائل کو صرف میاں بیوی کے تعلق یا روزمرہ اختلافات تک محدود کر کے نہیں سمجھا جاسکتا۔ گھر کا سکون دراصل انسان کی پوری زندگی کے توازن سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر میری پیشہ ورانہ زندگی بے ترتیب ہے، اگر سماجی اور تنظیمی ذمہ داریاں میرے تمام وقت پر قابض ہیں، یا اگر میں اپنی ذات کی تربیت اور آرام کو بالکل نظر انداز کر دوں تو اس کے اثرات بالآخر میرے گھر اور خاندان پر بھی پڑیں گے۔

اسی سوچ کے تحت میں نے اپنی ڈائری میں ایک خاکہ بنایا اور اسے عنوان دیا:

Four Pillars of My Life — میری زندگی کے چار ستون

میرے سامنے زندگی کے چار بڑے دائرے تھے: خاندان، کیریئر و پیشہ، تنظیمی و سماجی ذمہ داریاں، اور اپنی ذات کی تربیت و ذاتی ضروریات۔

یہ بظاہر ایک سادہ سا خاکہ تھا، مگر میرے لیے تدبیر منزل کے تصور میں ایک اہم پیش رفت تھی۔

پہلا ستون — خاندان

خاندان میری زندگی کا محض ایک حصہ نہیں تھا جسے باقی مصروفیات کے بعد بچ جانے والا وقت دے دیا

جائے۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ شریک حیات، بچے اور گھر کے دوسرے تعلقات مقررہ اور معیاری

وقت کے مستحق ہیں۔

ایک ڈاکٹر کی زندگی میں ڈیوٹیاں، مریض، ایمر جنسی، امتحانات اور تربیت کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اسی

طرح تنظیمی اور سماجی کام بھی جتنا وقت دیا جائے اتنا ہی بڑھ سکتا ہے۔

اگر خاندان کے لیے یہ سوچ ہو کہ جب وقت ملے گا تو گھر والوں کے ساتھ بیٹھوں گا تو اکثر وہ وقت کبھی

نہیں آتا۔ اس لیے تدبیر منزل کا ایک نیا اصول میرے سامنے آیا

خاندان کے لیے وقت بچانا نہیں، وقت مختص کرنا پڑتا ہے۔

اور صرف گھر میں موجود ہونا بھی کافی نہیں۔ جسم گھر میں ہو لیکن ذہن فون، کام یا اگلے منصوبے میں

مصروف ہو تو اسے حقیقی خاندانی وقت نہیں کہا جاسکتا۔

دوسرا ستون — پیشہ اور کیریئر

میری طبی زندگی میری شخصیت اور مقصد کا ایک اہم حصہ تھی۔ ڈاکٹر بننا میرے لیے صرف روزگار نہیں

تھا؛ علم حاصل کرنا، مہارت پیدا کرنا اور مریضوں کی خدمت کرنا بھی ایک ذمہ داری تھی۔

اس لیے کیریئر کو نظر انداز کر کے خاندانی توازن قائم کرنا بھی درست حل نہیں تھا۔

اصل سوال یہ تھا میں اپنے پیشے میں ترقی بھی کروں اور اس ترقی کی قیمت اپنے خاندان سے نہ وصول

کروں — یہ توازن کیسے قائم ہو؟

یہ سوال بعد کے پورے پیشہ ورانہ سفر میں میرے ساتھ رہا۔

میں نے سمجھا کہ کیریئر کی کامیابی کا معیار صرف عہدہ، آمدنی یا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پیشہ انسان کو مسلسل اتنا مصروف کر دے کہ اس کے قریب ترین رشتوں کے لیے اس کے پاس وقت، توجہ اور جذباتی توانائی باقی نہ رہے تو اس کامیابی کی قیمت پر غور کرنا ضروری ہے۔

تیسرا ستون — تنظیمی اور سماجی ذمہ داری

میری تنظیمی تربیت اور دعوتی سفر میری فکری زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا۔ اجتماعیت، معاشرتی ذمہ

داری، انسانوں کی تربیت اور خدمت کا شعور اسی سفر سے مضبوط ہوا تھا۔

لیکن یہاں بھی توازن ضروری تھا۔

اجتماعی خدمت ایک اعلیٰ مقصد ہو سکتی ہے، مگر اگر انسان معاشرے کی اصلاح میں اتنا مصروف ہو جائے

کہ اپنے گھر کے حقوق نظر انداز کرنے لگے تو اسے اپنی ترجیحات کا دوبارہ جائزہ لینا چاہیے۔

میرے لیے یہ ایک گہرا سبق تھا

اجتماعیت گھر سے شروع ہوتی ہے۔

اپنے خاندان کے حقوق ادا کیے بغیر وسیع تر اجتماعیت کا تصور نامکمل رہتا ہے۔

چوتھا ستون — اپنی ذات

میرے خاکے کا چوتھا حصہ Self تھا — اپنی ذات۔

ابتداء میں شاید یہ سب سے آسانی سے نظر انداز ہونے والا حصہ تھا۔ انسان خاندان، پیشہ اور سماجی ذمہ

داریوں میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ خود اپنی جسمانی، ذہنی، فکری اور روحانی ضرورتیں بھول جاتا ہے۔ لیکن میں نے آہستہ آہستہ سمجھا کہ خود کو وقت دینا خود غرضی نہیں، بشرطیکہ اس کا مقصد اپنی شخصیت کو بہتر اور متوازن بنانا ہو۔ مطالعہ، عبادت، خاموشی، ورزش، دوستوں کے ساتھ صحت مند تعلق، آرام اور اپنی کارکردگی کا جائزہ — یہ سب ذاتی تربیت کا حصہ ہیں۔

خالی برتن دوسروں کو پانی نہیں دے سکتا۔ مسلسل تھکا ہوا، ذہنی طور پر منتشر اور جذباتی طور پر خالی انسان اپنے خاندان، مریضوں یا معاشرے کو بھی اپنا بہترین حصہ نہیں دے سکتا۔

مسئلہ وقت کی کمی نہیں، ترجیحات کی ترتیب بھی ہے میرے اس صفحے کے نچلے حصے میں وقت کے مختلف بنانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ میں گھنٹوں کو تقسیم کر کے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہسپتال، تربیت اور دوسری ذمہ داریوں کے درمیان وقت کہاں موجود ہے اور اسے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ میرے لیے Time Management سے آگے Life Management کی طرف ایک ابتدائی قدم تھا۔

ہر انسان کے پاس چوبیس گھنٹے ہی ہوتے ہیں۔ مسئلہ ہمیشہ یہ نہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں؛ بعض اوقات مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم نے پہلے سے یہ طے نہیں کیا کہ کس چیز کو کتنا وقت ملنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے اپنے اوقات کو میں دیکھنا شروع کیا۔ کام کے اوقات الگ، خاندان کے لیے وقت الگ، تنظیمی ذمہ داری کے لیے مخصوص وقت اور اپنی تربیت و آرام کے لیے بھی کچھ گنجائش۔

یہ نظام ہمیشہ کامل نہیں چلتا تھا، مگر اس نے مجھے ایک بنیادی اصول دیا:

جس چیز کے لیے ہم باقاعدہ وقت مقرر نہیں کرتے، مصروف زندگی میں وہ آہستہ آہستہ ہماری ترجیحات سے باہر نکل جاتی ہے۔

مقدار نہیں، معیار بھی

وقت کی تقسیم کرتے ہوئے ایک اور سبق سامنے آیا: ہر تعلق صرف گھنٹوں کی تعداد سے مضبوط نہیں ہوتا۔ کبھی خاندان کے ساتھ ایک گھنٹہ پوری توجہ سے بیٹھنا، تین گھنٹے ساتھ رہتے ہوئے مسلسل فون دیکھنے سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح مطالعے کے دو گھنٹے، منتشر ذہن کے پانچ گھنٹوں سے زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں۔

یوں تدبیر منزل میں **quantity of time** کے ساتھ **quality of presence** بھی اہم ہو گئی۔

چار ستون ایک دوسرے کے حریف نہیں

ابتدا میں زندگی کے یہ چار دائرے مجھے کبھی کبھی ایک دوسرے کے مقابل محسوس ہوتے تھے۔ اگر

ہسپتال کو زیادہ وقت دوں تو خاندان متاثر ہوگا؛ خاندان کو زیادہ وقت دوں تو علمی ترقی کم ہوگی؛ تنظیمی

سرگرمی بڑھاؤں تو ذاتی وقت کم ہو جائے گا۔

لیکن بتدریج مجھے محسوس ہوا کہ انہیں حریف بنانے کے بجائے ایک دوسرے کا معاون بنایا جاسکتا ہے۔

اچھی ذاتی تربیت مجھے بہتر ڈاکٹر بناتی ہے۔

ایک پُر سکون خاندان مجھے پیشہ ورانہ زندگی کے لیے ذہنی قوت دیتا ہے۔

پیشہ مجھے خدمت اور معاشی استحکام فراہم کرتا ہے۔

تنظیمی و سماجی تربیت مجھے اپنی ذات سے باہر انسانوں کے بارے میں سوچنا سکھاتی ہے۔

اصل کامیابی کسی ایک ستون کو غیر معمولی طور پر بڑا کرنے میں نہیں بلکہ چاروں کے درمیان مناسب

توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں ہے۔

تدبیر منزل سے تدبیر زندگی تک

یہیں میرے لیے تدبیر منزل کا تصور مزید وسیع ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ گھر کو منظم کرنے کے لیے پوری زندگی کو منظم کرنا پڑتا ہے۔

وقت بے ترتیب ہو تو گھر متاثر ہوتا ہے۔

مالی معاملات بے ترتیب ہوں تو گھر متاثر ہوتا ہے۔

پیشہ حد سے بڑھ جائے تو گھر متاثر ہوتا ہے۔

انسان اپنی صحت اور شخصیت کو نظر انداز کرے تو گھر متاثر ہوتا ہے۔

اور گھر میں مسلسل اضطراب ہو تو اس کے اثرات انسان کے پیشے اور سماجی کردار پر بھی پڑتے ہیں۔

اس طرح تدبیر منزل میرے لیے محض نہیں رہی؛ یہ **balanced life management** کا تصور بنتی گئی۔

حضرت شاہ سعید احمد رائے پوریؒ سے حاصل ہونے والا مشاورت کا اصول اور حضرت مولانا مفتی عبدالحق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم کی تربیتی نسبت میں زندگی کو ایک مربوط اکائی کے طور پر دیکھنے کا شعور میرے لیے اس سفر میں رہنمائی کا ذریعہ بنتا رہا۔

آج اپنے برسوں پرانے اس چھوٹے سے دائرے کو دیکھتا ہوں، جس پر میں نے لکھا تھا Four Pillars of My Life، تو مجھے اس کے پیچھے ایک بہت بڑا سبق نظر آتا ہے:

زندگی کی کامیابی صرف ایک میدان فتح کرنے کا نام نہیں۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان اپنے رب سے تعلق، اپنی ذات کی تربیت، اپنے خاندان کے حقوق، اپنے پیشے کی ذمہ داری اور معاشرے کی خدمت کو ایک متوازن اور با مقصد زندگی میں جوڑنے کی مسلسل کوشش کرے۔

یہی تدبیر منزل سے تدبیر زندگی کی طرف میرے شعور کے سفر کا اگلا قدم تھا۔

باب پنجم

وسائل اور شعوری زندگی — وقت، سفر اور مقصد

ہر اہم چیز کی قیمت صرف روپے میں نہیں ہوتی۔

انسان کی زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ کبھی یہ حرکت روزگار کے لیے ہوتی ہے، کبھی علم کے حصول

کے لیے، کبھی رشتوں کو نبھانے کے لیے اور کبھی ذہنی سکون اور تفریح کے لیے۔ سفر بھی انسانی زندگی

کا ایک خوبصورت حصہ ہے۔ نئی جگہیں دیکھنا، قدرت کے قریب جانا، روزمرہ کی یکسانیت سے نکلنا اور

اہل خانہ کے ساتھ وقت گزارنا یقیناً انسان کو تازگی عطا کرتا ہے۔ لیکن زندگی کے ایک مرحلے پر پہنچ کر

یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ہر سفر واقعی ضروری اور مفید ہے یا نہیں؟

ستمبر میں نتھیا گلی کے ایک سفر کے دوران مجھے اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع ملا۔ پہاڑ،

سبزہ، ٹھنڈی ہوا اور فطرت اپنی جگہ دل کش تھے، لیکن سفر کے دوران پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی

مشکلات نے مجھے سفر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور کیا۔

سفر کی قیمت صرف پیسہ نہیں

ہم عموماً سفر کے اخراجات کو ہوٹل، گاڑی، پٹرول اور کھانے کے حساب سے دیکھتے ہیں، لیکن حقیقت

میں سفر کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

وقت بھی ایک سرمایہ ہے۔

طویل سفر میں کئی گھنٹے سڑک پر گزر جاتے ہیں۔ پہاڑی راستوں پر گاڑی چلانے کی تھکن اور حادثات کا خطرہ الگ ہوتا ہے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد رہائش اگر آرام دہ نہ ہو تو جس سکون کے لیے گھر سے نکلے تھے، وہی سکون مفقود ہو جاتا ہے۔

کھانے کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ گھر میں انسان اپنی ضرورت اور صحت کے مطابق غذا لے سکتا ہے، جبکہ سفر میں اکثر دستیاب کھانے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ صفائی، حفظانِ صحت، ہجوم اور نیند کا معیار بھی متاثر ہو سکتا ہے۔

ایک مسلمان کے لیے اس سے بھی بڑھ کر اہم سوال نماز اور عبادات کا ہے۔ اگر سفر کی منصوبہ بندی ایسی ہو کہ نمازیں مسلسل تاخیر، جلد بازی یا بے ترتیبی کا شکار ہونے لگیں تو تفریح کی قیمت پر دوبارہ غور کرنا چاہیے۔

مجھے اس سفر میں شدت سے احساس ہوا کہ

وسائل کا ضیاع صرف مال کا ضیاع نہیں؛ وقت، صحت، توانائی، توجہ اور ذہنی سکون بھی ہمارے وسائل ہیں۔

پھر کیا گھر ہی بہتر ہے؟

اس سوچ کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ انسان سفر چھوڑ دے۔

گھر سکون کی بنیادی جگہ ہے۔ اپنا بستر، اپنی غذا، اپنی ترتیب اور اپنی عبادات کا معمول انسان کو وہ سہولت دیتے ہیں جو بہترین ہوٹل بھی ہمیشہ فراہم نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر انسان مسلسل ایک ہی ماحول اور معمول میں رہے تو زندگی میں جمود بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

سفر معمول کو توڑتا ہے۔

نئی جگہ انسان کے ذہن کو تازگی دیتی ہے۔ قدرت کے قریب وقت گزارنے سے روزمرہ کی مصروفیات سے ذہنی فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ سفر مشترکہ یادیں تخلیق کرتا ہے۔ مختلف لوگوں، علاقوں اور تہذیبوں کو دیکھنے سے انسان کا زاویہ نگاہ وسیع ہوتا ہے۔

اس لیے مسئلہ سفر کرنا یا نہ کرنا نہیں۔

اصل مسئلہ ہے

بامقصد سفر یا بے مقصد سفر؟

سفر سے پہلے پانچ سوال

میں نے اپنے لیے یہ اصول اخذ کیا کہ آئندہ کسی سفر کا فیصلہ صرف یہ دیکھ کر نہیں ہونا چاہیے کہ چھٹی موجود ہے یا کوئی خوبصورت جگہ دستیاب ہے۔ سفر سے پہلے اپنے آپ سے پانچ سوال پوچھنے چاہئیں:

اول: مقصد کیا ہے؟

کیا یہ سفر خاندان کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے، ذہنی آرام، فطرت سے قربت، علم، پیشہ ورانہ ترقی،

دعوت، عبادت یا کسی ضروری ذمہ داری کے لیے ہے؟

دوم: فائدہ کتنا ہے؟

جو وقت، پیسہ اور توانائی خرچ ہوگی، کیا اس کے مقابلے میں حاصل ہونے والا فائدہ مناسب ہے؟

سوم: خاندان کا فائدہ کیا ہے؟

کیا اہل خانہ خصوصاً بچوں کے لیے یہ سفر خوشی، تربیت، تجربہ یا اچھی یاد کا ذریعہ بنے گا؟

چہارم: بنیادی ضروریات کا انتظام کیسا ہوگا؟

نماز، حلال اور مناسب غذا، صفائی، آرام، محفوظ سفر اور اچھی رہائش پہلے سے سوچنی چاہیے۔

پنجم: اس سفر کی Opportunity Cost کیا ہے؟

میں اس سفر کے لیے کس چیز کو چھوڑ رہا ہوں؟ خاندان کا سکون؟ ضروری کام؟ مطالعہ؟ صحت؟ آرام؟ یا

کوئی زیادہ اہم ذمہ داری؟

ان سوالات کے بعد اگر سفر کا مقصد واضح اور فائدہ نمایاں ہو تو سفر کرنا چاہیے، لیکن اگر جواب صرف یہ

ہو کہ ”کہیں چلتے ہیں“ تو شاید گھر میں ایک پرسکون دن زیادہ قیمتی ثابت ہو۔

ہر وقت مصروف رہنا Productivity نہیں

اس سفر نے میری ایک اور سوچ بھی درست کی۔

میں نے اپنے نوٹس کے آخر میں لکھا

میں نے اپنے نوٹس میں انگریزی میں ایک جملہ لکھا تھا: “Cannot afford wastage of

resources — Be productive”.

بعد کے غور نے اس جملے کو بھی بدلا۔ مجھے محسوس ہوا کہ productive کے بجائے intentional —

یعنی شعوری اور با مقصد — ہونا زیادہ موزوں ہے۔

زندگی کا ہر لمحہ کتاب لکھنے، مریض دیکھنے، منصوبہ بنانے یا کوئی قابلِ پیائش نتیجہ پیدا کرنے کے لیے نہیں

ہوتا۔ کبھی بچوں کے ساتھ بیٹھنا بھی ایک سرمایہ کاری ہے۔

کبھی اہلیہ کے ساتھ خاموشی سے چائے پینا بھی اہم ہے۔

کبھی پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر خاموش بیٹھنا بھی ذہن کی ضرورت ہے۔

اور کبھی کوئی کام نہ کر کے جسم اور ذہن کو آرام دینا بھی اگلے کام کی تیاری ہے۔

اصل مسئلہ آرام نہیں، بے مقصدیت ہے۔

کم سفر، مگر بہتر سفر

اس تجربے کے بعد میرے لیے ایک متوازن اصول سامنے آیا

سفر کم ہو سکتا ہے، لیکن جب ہو تو با مقصد، محفوظ، آرام دہ اور یادگار ہو۔ ضروری نہیں کہ ہر سفر طویل

ہو۔ ایک مختصر اور اچھی طرح منصوبہ بنایا ہوا خاندانی سفر کئی دن کے تھکا دینے والے سفر سے زیادہ فائدہ

مند ہو سکتا ہے۔

منزلوں کی تعداد بڑھانے کے بجائے تجربے کا معیار بہتر کیا جائے۔ جلدی جلدی کئی جگہیں دیکھنے کے بجائے ایک جگہ سکون سے وقت گزارا جائے۔ رات کے خطرناک سفر کے بجائے دن میں سفر کیا جائے۔ رہائش، کھانے اور نماز کی جگہ پہلے سے طے کی جائے۔

یوں سفر خود ایک نئی مصروفیت بننے کے بجائے واقعی زندگی میں تازگی پیدا کرے گا۔

تدبیر منزل کا ایک اصول

نتھیا گلی کا یہ سفر میرے لیے محض پہاڑوں کی سیر نہیں رہا۔ اس نے مجھے تدبیر منزل کے ایک بنیادی اصول کی طرف متوجہ کیا۔

گھر اور خاندان کا انتظام صرف آمدن اور اخراجات کا حساب نہیں۔ اس میں وقت، صحت، تعلقات، سکون اور ترجیحات کا انتظام بھی شامل ہے۔

مال دوبارہ کمایا جاسکتا ہے، لیکن گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ بچوں کا بچپن دوبارہ نہیں آتا۔ صحت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی اور بعض مواقع زندگی میں صرف ایک مرتبہ آتے ہیں۔

اس لیے وسائل کو بچانے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان زندگی کی خوشیاں ختم کر دے۔ بلکہ اصل حکمت یہ ہے کہ وسائل کو وہاں خرچ کیا جائے جہاں ان سے حقیقی خیر، سکون اور فائدہ پیدا ہو۔

میرا آئندہ کا اصول اس سفر سے میں نے اپنے لیے ایک مختصر اصول اخذ کیا:

وقت، صحت، مال اور خاندان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانتیں ہیں۔ سفر وہاں ہو جہاں مقصد واضح ہو، فائدہ

خرچ سے زیادہ ہو، عبادات اور ذمہ داریاں محفوظ رہیں، خاندان قریب آئے اور انسان واپسی پر زندگی

سے زیادہ تھکا ہوا نہیں بلکہ زیادہ تازہ، شکر گزار اور بامقصد ہو۔

شاید اچھا سفر وہ نہیں جس میں ہم سب سے زیادہ مقامات دیکھ لیں۔

اچھا سفر وہ ہے جس سے واپس آکر ہم اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنے وقت اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں

کی قدر پہلے سے زیادہ کرنے لگیں۔

باب ششم

غلط نظام میں درست نیت — حکمتِ عمل کے اصول

نظام کے اندر رہو، مگر نظام کی خرابی کو اپنے اندر نہ آنے دو۔

میرا شعوری سفر آگے بڑھا تو ایک سوال بار بار میرے سامنے آنے لگا: اگر انسان خود کسی غلط نظام کا حصہ بن جائے تو وہ کیا کرے؟

یہ سوال بظاہر آسان ہے۔ انسان فوراً کہہ سکتا ہے کہ غلط نظام کو چھوڑ دینا چاہیے یا اس کے خلاف کھڑا ہو جانا چاہیے۔ لیکن عملی زندگی اتنی سادہ نہیں ہوتی۔ ہم خاندان، ادارے، معاشرے اور پیشہ ورانہ زندگی میں ایسے بہت سے نظاموں کا حصہ ہوتے ہیں جنہیں ہم نے خود نہیں بنایا ہوتا۔ ان میں کئی کمزوریاں پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ بعض روایات غلط ہوتی ہیں، ترجیحات غیر متوازن ہوتی ہیں اور کبھی ایسا ماحول بن جاتا ہے جس میں درست کام کرنا بھی آسان نہیں رہتا۔

ایسے حالات میں میرے سامنے اصل سوال یہ بنا

کیا ایک خراب نظام کے اندر رہتے ہوئے بھی انسان اپنی نیت، کردار اور عمل کو درست رکھ سکتا ہے؟

وقت کے ساتھ میرا جواب ہاں کی طرف گیا، لیکن اس کے لیے محض اچھی نیت کافی نہیں۔ اچھی نیت

کے ساتھ حکمت، صبر، تدبیر اور حقیقت پسندی بھی ضروری ہے۔

نظام کی خرابی اور فرد کی ذمہ داری

ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ انسان نظام کی تمام خرابیوں کا بوجھ اپنے سر لے لے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ ہر غلطی کو نظام کے کھاتے میں ڈال کر خود کو ہر ذمہ داری سے آزاد سمجھ لے۔

مجھے محسوس ہوا کہ شعوری طرزِ عمل ان دونوں کے درمیان ہے۔

میں پورا نظام ایک دن میں تبدیل نہیں کر سکتا، لیکن اپنے دائرہ اختیار میں ہونے والے کام کی ذمہ داری ضرور لے سکتا ہوں۔

جو میرے اختیار میں نہیں، اسے سمجھنا ہے؛ جو میرے اختیار میں ہے، اسے بہتر کرنا ہے۔ یہ فرق سمجھ آجائے تو انسان مسلسل غصے، مایوسی اور شکایت سے نکل کر عمل کی طرف آنا شروع کرتا ہے۔

اچھی نیت کافی کیوں نہیں؟

انسان کبھی نیک مقصد کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کر لیتا ہے جو مزید نقصان پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اصلاح چاہتا ہے مگر اس کا انداز تصادم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ حق بات کہنا چاہتا ہے مگر وقت اور موقع کا لحاظ نہیں کرتا۔ وہ کسی خرابی کو فوراً ختم کرنا چاہتا ہے مگر اس جلد بازی سے پہلے سے موجود نظام مزید غیر مستحکم ہو جاتا ہے۔

تب مجھے سمجھ آنے لگا کہ نیت کی درستی کے ساتھ طریقہ کار کی درستی بھی ضروری ہے۔ ہر سچی بات ہر وقت ایک ہی انداز میں نہیں کہی جاسکتی اور ہر خرابی ایک ہی دن میں درست نہیں ہو سکتی۔

اصلاح بھی ایک فن ہے۔

Minimum Harm — کم سے کم نقصان

میرے نوٹس میں ایک اہم تصور Minimum Harm کا تھا۔

اگر میرے پاس فوری طور پر مثالی حل موجود نہیں تو کم از کم ایسا قدم نہ اٹھاؤں جس سے نقصان مزید بڑھ جائے۔ یہ سوچ میرے لیے بہت عملی ثابت ہوئی۔

بعض حالات میں ہمارے سامنے بہترین اور بدترین کا انتخاب نہیں ہوتا، بلکہ دو نامکمل راستوں میں سے نسبتاً بہتر راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کس فیصلے سے انسانوں، ادارے اور مقصد کو کم سے کم نقصان پہنچے گا اور مستقبل میں اصلاح کا راستہ بھی کھلا رہے گا۔

اس کا مطلب غلط کو درست قرار دینا نہیں، بلکہ حقیقت کو سمجھتے ہوئے اصلاح کی گنجائش محفوظ رکھنا ہے۔

الزام سے حل تک

خراب نظام میں سب سے آسان کام لوگوں کو مورد الزام ٹھہرانا ہے۔

فلاں شخص غلط ہے۔

انتظامیہ غلط ہے۔

لوگ نہیں سمجھتے۔

معاشرہ خراب ہے۔

لیکن مسلسل الزام انسان کو ایک عجیب ذہنی قید میں ڈال دیتا ہے۔ اسے ہر طرف مسئلے نظر آنے لگتے ہیں لیکن اپنی قوتِ عمل دکھائی نہیں دیتی۔

میں نے اپنے لیے ایک سوال اختیار کرنا شروع کیا
”اس صورتحال میں میری طرف سے بہتر قدم کیا ہو سکتا ہے؟“
یہ چھوٹا سا سوال انسان کو شکایت سے تدبیر کی طرف لے جاتا ہے۔

Creative Solution — تیسرا راستہ تلاش کرنا

زندگی کے بہت سے مسائل صرف دو راستے پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں: یا مکمل سمجھوتا کرو یا مکمل تصادم۔

لیکن شعوری فکر انسان کو تیسرا راستہ تلاش کرنا سکھاتی ہے۔

یہی میرے نوٹس میں Creative Solution کا تصور تھا۔

اگر کسی ادارے میں کوئی طریقہ غلط ہے تو ضروری نہیں کہ پہلے دن پوری عمارت کو چیلنج کر دیا جائے۔

شاید اپنے شعبے میں ایک بہتر نمونہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ شاید چند لوگوں کو ساتھ ملا کر چھوٹی تبدیلی شروع

کی جاسکتی ہے۔ شاید اعداد و شمار اور نتائج کے ذریعے لوگوں کو قائل کیا جاسکتا ہے۔ شاید پہلے اعتماد پیدا

کر کے بعد میں بڑی اصلاح کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

یعنی سوال صرف یہ نہیں

”یہ نظام غلط کیوں ہے؟“

بلکہ زیادہ مفید سوال یہ ہے

”موجودہ حقیقت کے اندر درست کام کے لیے کتنی جگہ پیدا کی جاسکتی ہے؟“

ہر اختلاف کو جنگ نہ بنانا

غلط نظام میں کام کرتے ہوئے ایک اور خطرہ مسلسل arguments میں پڑ جانا ہے۔

انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ اس کا مقصد درست ہے، اس لیے اسے ہر موقع پر اپنا موقف ثابت

کرنا چاہیے۔ لیکن ہر بحث اصلاح نہیں لاتی۔ بعض بحثیں صرف فاصلے بڑھاتی ہیں۔

میں نے آہستہ آہستہ یہ سیکھا کہ ہر اعتراض کا جواب دینا ضروری نہیں۔ ہر شخص کو اسی لمحے قائل کرنا

ضروری نہیں۔ بعض اوقات خاموشی، اچھا کام اور مستقل مزاجی ایک طویل بحث سے زیادہ مؤثر دلیل

بن جاتے ہیں۔

خصوصاً لوگوں کے سامنے کسی کو نیچا دکھا کر اصلاح کی توقع رکھنا اکثر الٹا اثر پیدا کرتا ہے۔ انسان اپنی غلطی

تسلیم کرنے کے بجائے اپنی عزت بچانے میں لگ جاتا ہے۔

اس لیے جہاں ممکن ہو، اصلاح کا راستہ تحقیر کے بجائے احترام اور تصادم کے بجائے مکالمہ ہونا چاہیے۔

لیکن یہاں ایک بہت باریک خطرہ بھی موجود ہے۔

غلط نظام میں رہتے رہتے انسان اس کی غلطیوں کا عادی ہو سکتا ہے۔

شروع میں جس چیز پر دل بے چین ہوتا ہے، کچھ عرصے بعد وہ معمول محسوس ہونے لگتی ہے۔ انسان اپنے سمجھوتوں کے لیے دلائل پیدا کرنے لگتا ہے اور بالآخر ”سٹم ایسا ہی ہے“ ایک مستقل جواز بن جاتا ہے۔

اس لیے میرے لیے ایک بنیادی اصول یہ بنا
نظام کے اندر رہو، مگر نظام کی خرابی کو اپنے اندر نہ آنے دو۔
اپنی نیت کا محاسبہ کرتے رہنا، اصولوں کو یاد رکھنا، اہل فکر سے مشورہ کرنا اور وقتاً فوقتاً اپنے فیصلوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اصلاح ایک تدریجی سفر ہے
میری زندگی کے مختلف مراحل نے مجھے یہ سمجھایا کہ پائیدار تبدیلی اکثر شور سے نہیں بلکہ مسلسل چھوٹے درست اقدامات سے پیدا ہوتی ہے۔
ایک درست فیصلہ۔

ایک مریض کے ساتھ بہتر رویہ۔
ایک طالب علم کی اچھی تربیت۔
ایک غیر ضروری خرابی کو روک دینا۔
ایک بہتر طریقہ کار متعارف کرادینا۔

ایک شخص کو اپنے مقصد میں شریک کر لینا۔

یہ چھوٹے کام بظاہر پورا نظام تبدیل نہیں کرتے، لیکن یہی چھوٹی تبدیلیاں وقت کے ساتھ نئی ثقافت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

شعوری سفر کا ایک نیا اصول

میرے لیے شعور کا مطلب اب صرف یہ نہیں رہا کہ میں صحیح اور غلط کو پہچان سکوں۔ اصل امتحان یہ ہے کہ غلط حالات کے درمیان صحیح عمل کیسے کیا جائے۔ آسان ماحول میں اچھا ہونا نسبتاً آسان ہے۔ اصل تربیت اس وقت ہوتی ہے جب ماحول مثالی نہ ہو، راستے محدود ہوں، لوگ آپ کی بات پوری طرح نہ سمجھتے ہوں، اور اس کے باوجود آپ اپنی نیت اور کردار کو محفوظ رکھتے ہوئے خیر کے لیے جگہ پیدا کرتے رہیں۔

اس تجربے سے میرے لیے ایک اصول سامنے آیا

غلط نظام میں رہنا ہمیشہ انسان کو غلط نہیں بناتا؛ لیکن غلط نظام کے سامنے اپنی نیت، اصول اور مقصد کھودینا اصل شکست ہے۔ جہاں پورا نظام بدلنا ممکن نہ ہو، وہاں اپنے دائرہ اختیار میں خیر پیدا کرو، نقصان کو کم کرو، تصادم کے بجائے حکمت اختیار کرو اور مسلسل ایسا نمونہ قائم کرو جو بتدریج تبدیلی کا راستہ کھول سکے۔ شاید یہی انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف میرے سفر کا ایک اہم مرحلہ تھا۔ میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ اجتماعی تبدیلی صرف نظام کے خلاف کھڑے ہونے سے نہیں آتی؛ کبھی اس نظام کے اندر موجود رہ کر،

اس کی حقیقت کو سمجھ کر، لوگوں کو ساتھ لے کر اور صحیح نیت کو صحیح تدبیر میں تبدیل کر کے بھی تبدیلی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

غلط نظام میں کام کرنے کے چار اصول

اپنے تجربات پر غور کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ صرف یہ جان لینا کافی نہیں کہ نظام میں خرابی موجود ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ایسے نظام میں میرا اپنا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ میرے لیے اس کا جواب چار بنیادی اصولوں میں سامنے آیا:

۱۔ موجودہ حالات میں بہترین ممکن راستہ اختیار کرنا

ہر وقت ہمارے سامنے مثالی حالات موجود نہیں ہوتے۔ بعض اوقات انسان کو ایسے ماحول میں کام کرنا پڑتا ہے جس کے بہت سے پہلو اس کی سوچ اور اصولوں کے مطابق نہیں ہوتے۔

ایسی صورت میں پورے نظام کے درست ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ:

موجودہ حالات میں سب سے بہتر ممکن کام کیا ہے جو میں کر سکتا ہوں؟

یعنی نامکمل حالات کو بے عملی کا جواز نہ بنایا جائے۔ جہاں جتنی خیر ممکن ہو، اتنی خیر پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

۲۔ Minimum Harm — نقصان کو کم سے کم رکھنا

اگر کسی مسئلے کا مکمل اور مثالی حل فوری طور پر ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ کوشش ضرور ہونی چاہیے کہ ہماری

وجہ سے مسئلہ مزید خراب نہ ہو۔ کبھی اصلاح کی جلد بازی خود نئے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے فیصلہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سا راستہ لوگوں، ادارے اور اصل مقصد کو کم سے کم نقصان پہنچائے گا۔

ہر مسئلہ فوراً ختم کرنا ممکن نہیں، لیکن اسے مزید بڑھنے سے روکنا اکثر ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔

۳۔ Creative Solution — تصادم کے بجائے نیا راستہ تلاش کرنا

غلط نظام اکثر انسان کو دو راستوں کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے: مکمل سمجھوتہ یا مکمل تصادم۔

لیکن شعوری فکر کا تقاضا ہے کہ انسان تیسرا راستہ تلاش کرے۔

کبھی چھوٹے پیمانے پر بہتر نظام قائم کیا جاسکتا ہے، کبھی لوگوں کو ساتھ ملا کر تدریجی تبدیلی لائی جاسکتی

ہے، کبھی اپنے کام کے نتائج سے دوسروں کو قائل کیا جاسکتا ہے اور کبھی صحیح وقت کا انتظار کرنا بھی

حکمت کا حصہ ہوتا ہے۔

اصلاح کا بہترین راستہ ہمیشہ سب سے زیادہ شور و آلاں سے نہیں ہوتا۔

۴۔ غیر ضروری بحث اور محاذ آرائی سے اجتناب

ہر غلط بات پر بحث کرنا اور ہر شخص کو فوراً قائل کرنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں۔ خصوصاً لوگوں کے

سامنے بحث اور کسی فرد کو غلط ثابت کرنے کی کوشش اکثر اصلاح کے بجائے ضد اور دفاعی رویہ پیدا کرتی

ہے۔

اپنا موقف واضح رکھا جائے، مگر شخصیت پر حملہ نہ کیا جائے۔ جہاں گفتگو فائدہ مند ہو وہاں دلیل دی

جائے، اور جہاں بحث صرف کشیدگی بڑھا رہی ہو وہاں رک جانا بھی شعوری رویہ ہے۔

مقصد دلیل جیتنا نہیں، خیر کے لیے راستہ پیدا کرنا ہے۔

یہ چار اصول مجھے اس نتیجے تک لے گئے کہ اچھی نیت کو مؤثر بنانے کے لیے اچھی تدبیر ضروری ہے۔

صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میرا مقصد درست ہے؛ مجھے یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ میرے طریقہ کار کے نتائج کیا نکل رہے ہیں۔

میرے شعوری سفر میں یہ ایک اہم تبدیلی تھی

اصلاح کا مطلب ہر وقت نظام سے ٹکرا جانا نہیں؛ بعض اوقات نظام کے اندر اپنی جگہ پر خیر قائم کرنا، شر

کو محدود کرنا، لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا اور مناسب وقت پر مناسب قدم اٹھانا زیادہ پائیدار تبدیلی کا

ذریعہ بنتا ہے۔

اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں نیک نیتی، شعور سے آگے بڑھ کر حکمت میں تبدیل ہوتی ہے۔

باب ہفتم

دعوت و تربیت — انسان کو سمجھنے سے شعور بیدار کرنے تک

دعوت کا مقصد لوگوں کو اپنے جیسا بنانا نہیں؛ انہیں سوچنے اور خیر میں حصہ لینے کے قابل بنانا ہے۔ میرے شعوری سفر میں ایک اہم مرحلہ وہ تھا جب میں نے دعوت کو محض کسی نظریے کو بیان کرنے، لوگوں کو قائل کرنے یا انہیں کسی تنظیمی سرگرمی میں شامل کرنے کے مفہوم سے آگے بڑھ کر سمجھنا شروع کیا۔ وقت، تجربے، ساتھیوں کے ساتھ کام اور اجتماعی جدوجہد نے یہ احساس پیدا کیا کہ دعوت دراصل انسان شناسی، تدریج، اعتماد، مکالمے اور اجتماعی شعور کی تعمیر کا عمل ہے۔

میرے نوٹس میں دعوت و تربیت کے حوالے سے بار بار ایک بنیادی بات سامنے آتی ہے: ہر انسان مختلف ہے۔ اس کی طبیعت، ذہنی سطح، سابقہ تجربات، صلاحیتیں، سوالات اور زندگی کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے دعوت کا ایک ہی طریقہ ہر شخص پر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ دعوت کا آغاز اپنی بات سنانے سے پہلے دوسرے انسان کو سمجھنے سے ہونا چاہیے۔

1۔ تدریج — تبدیلی ایک دم نہیں آتی

دعوت اور تربیت میں پہلا اصول تدریج ہے۔

انسان کی فکر برسوں کے تجربات، ماحول، خاندان، تعلیم اور معاشرتی اثرات سے بنتی ہے۔ یہ توقع رکھنا حقیقت پسندانہ نہیں کہ چند گفتگوؤں میں اس کی پوری فکری ساخت تبدیل ہو جائے گی۔

اسی لیے دعوت میں جلد بازی کے بجائے انسان کو سہولت کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔

فکری تبدیلی مسلط نہیں کی جاتی، اسے بتدریج پروان چڑھایا جاتا ہے۔

ایک داعی کا کام بیچ ڈالنا، سوال پیدا کرنا، مطالعے کی طرف متوجہ کرنا اور سوچنے کا ماحول فراہم کرنا ہے۔

نتیجہ فوراً حاصل کرنے کی بے چینی دعوت کو تربیت کے بجائے دباؤ میں تبدیل کر سکتی ہے۔

2۔ سوال پیدا کریں، صرف جواب نہ دیں

میرے لیے ایک اہم سبق یہ تھا کہ لوگوں کو صرف تیار شدہ جوابات دینا کافی نہیں۔ انہیں سوچنے اور

سوال کرنے کی طرف لانا زیادہ اہم ہے۔

جب انسان خود سوال کرتا ہے تو جواب اس کے لیے محض ایک خارجی معلومات نہیں رہتا بلکہ اس کی اپنی

فکری تلاش کا حصہ بن جاتا ہے۔

اس لیے دعوت میں گفتگو یک طرفہ تقریر نہیں ہونی چاہیے۔ سوال کیا جائے، دوسرے کا نقطہ نظر سنا

جائے، پھر اسے مزید غور کرنے کے لیے سوال دیا جائے۔ ”آپ اس مسئلے کو کس طرح دیکھتے ہیں؟“

بعض اوقات ایسا ایک سوال طویل تقریر سے زیادہ فکری حرکت پیدا کر سکتا ہے۔

3۔ موجودہ مسائل سے دعوت کا تعلق

دعوت صرف نظری اور تاریخی گفتگو بن کر نہ رہ جائے۔ میرے نوٹس میں یہ نکتہ بھی نمایاں ہے کہ

مذہبی اور فکری گفتگو کو موجودہ معاشرتی مسائل کے حل سے جوڑنا ضروری ہے۔ انسان فطری طور پر یہ

جاننا چاہتا ہے کہ جو فکر اس کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، وہ اس کی حقیقی زندگی، خاندان، معاشرے، معیشت، تعلیم، اخلاق اور اجتماعی مسائل کے بارے میں کیا رہنمائی دیتی ہے۔

دعوت اس وقت زیادہ بامعنی ہوتی ہے جب نظریہ زندگی کے حقیقی سوالات سے گفتگو کرنے لگے۔

4۔ اختلاف سے پہلے مشترکات تلاش کریں

دعوت کے سفر میں میرے لیے ایک بہت اہم اصول یہ بنا کہ گفتگو کا آغاز اختلاف سے نہ کیا جائے۔ ہم اکثر دوسرے شخص سے ملتے ہی یہ تلاش کرنے لگتے ہیں کہ اس کے اور ہمارے درمیان فرق کہاں ہے۔ نتیجتاً گفتگو شروع ہونے سے پہلے ہی دفاعی ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس پہلے Similarities — مشترکات تلاش کرنا زیادہ مفید ہے۔

ہم دونوں کن باتوں پر متفق ہیں؟

انسانی بھلائی؟ عدل؟ خاندان کی بہتری؟ تعلیم؟ اخلاق؟ معاشرتی ذمہ داری؟ ظلم سے نفرت؟ ایک بہتر معاشرے کی خواہش؟

یہ Common Ground آگے کی گفتگو کی بنیاد بنتا ہے۔

اختلاف کو سمجھنے سے پہلے اتفاق کی زمین تلاش کرنا دعوت کی حکمت ہے۔

5۔ انسان کو لیبل کے بجائے انسان سمجھنا

کسی شخص کو اس کے مسلک، جماعت، پیشے یا سماجی شناخت کے ایک خانے میں رکھ دینا آسان ہے، مگر

اس سے اس کی پوری شخصیت ہمارے سامنے نہیں آتی۔

ہر انسان کے اپنے تجربات، دکھ، کامیابیاں، خوف، سوالات اور ترجیحات ہوتی ہیں۔

دعوت میں پہلے انسان کو انسان کی حیثیت سے سمجھنا ضروری ہے۔ جب انسان محسوس کرتا ہے کہ سامنے

والا مجھے صرف تبدیل کرنے نہیں بلکہ سمجھنے آیا ہے تو حقیقی رابطہ پیدا ہونے لگتا ہے۔

6۔ موجودہ ذہنی سطح سے گفتگو شروع کریں

ہر شخص کو وہیں سے آگے لے جایا جاسکتا ہے جہاں وہ اس وقت موجود ہے۔

اگر ہم اپنی فکری منزل سے گفتگو شروع کریں اور دوسرے کی موجودہ ذہنی کیفیت کو نظر انداز کر دیں تو

ممکن ہے ہماری بات درست ہونے کے باوجود اس تک نہ پہنچ سکے۔ اس لیے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ

سامنے والا اس وقت کہاں کھڑا ہے، کیا سوچتا ہے اور کن سوالات سے گزر رہا ہے۔

دعوت میں منزل اہم ہے، مگر نقطہ آغاز پہچاننا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

7۔ فوری انکار کے بجائے سوال: جب کوئی شخص ایسی بات کرے جس سے میں متفق نہ ہوں تو فوراً یہ کہہ

دینا کہ ”آپ غلط ہیں“ گفتگو کا دروازہ بند کر سکتا ہے۔ اس کے بجائے سوال کیا جاسکتا ہے

آپ اس نتیجے تک کیسے پہنچے؟ اگر اسے دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو کیا صورت بن سکتی ہے؟

اس طریقے سے اختلاف برقرار رہتے ہوئے بھی مکالمہ جاری رہتا ہے۔ مقصد ہر گفتگو میں فتح حاصل کرنا

نہیں بلکہ سوچنے کا عمل پیدا کرنا ہے۔

8۔ اعتماد پہلے، فکری گفتگو بعد میں

میرے نوٹس کا ایک نہایت اہم اصول Confidence حاصل کرنا ہے۔

گہری فکری گفتگو اعتماد کے بغیر مشکل ہوتی ہے۔ پہلے انسان کے ساتھ تعلق قائم ہو، اسے یقین ہو کہ اس

کی عزت محفوظ ہے اور اس کے سوالات کو حقارت سے نہیں دیکھا جائے گا۔ اس کے بعد نظریات کو

آہستہ آہستہ گفتگو میں لایا جاسکتا ہے۔ دل کا دروازہ بند ہو تو مضبوط دلیل بھی اندر نہیں جاتی۔

اس لیے دعوت صرف الفاظ نہیں، بلکہ کردار، تعلق اور اعتماد کا نام بھی ہے۔

9۔ تنہائی کے بجائے اجتماعی فکر

شعوری سفر نے مجھے انفرادی سوچ کی اہمیت کے ساتھ اس کی محدودیت بھی سمجھائی۔ ایک شخص بہت

کچھ سوچ سکتا ہے، لیکن معاشرتی مسائل اجتماعی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان کے حل کے لیے بھی

Collective Thinking — اجتماعی فکر پیدا کرنا ضروری ہے۔

مطالعہ، گفتگو، مشاورت اور اجتماعی سرگرمی کے ذریعے لوگوں کو یہ سمجھنے میں مدد دی جائے کہ ان کے

مسائل صرف انفرادی نہیں بلکہ ایک بڑے سماجی تناظر سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں

دعوت انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف سفر بن جاتی ہے۔

ہر شخص ایک ہی کام کے لیے نہیں۔ میرے نوٹس میں ایک اور اہم حقیقت سامنے آئی۔ ضروری نہیں

کہ ہر شخص دعوت کے میدان میں ایک ہی انداز سے کام کرے۔

ہر انسان کی اپنی طبیعت، مزاج اور قابلیت ہوتی ہے۔ کوئی اچھا مقرر ہو سکتا ہے، کوئی بہترین استاد، کوئی منتظم، کوئی لکھنے والا، کوئی تحقیق کرنے والا، کوئی نوجوانوں سے بہتر رابطہ قائم کر سکتا ہے اور کوئی خاموشی سے عملی خدمت کے ذریعے لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

لہذا اجتماعی جدوجہد میں کامیابی کا مطلب یہ نہیں کہ سب کو ایک جیسا بنادیا جائے۔ اصل کام یہ ہے کہ انسان کو بنیادی فکر اور اجتماعی مقصد سمجھایا جائے اور پھر اس کی صلاحیت کو مناسب جگہ استعمال ہونے دیا جائے۔

وحدت کا مطلب یکسانیت نہیں؛ مختلف صلاحیتوں کا مشترک مقصد کے لیے منظم ہونا ہے۔ اجتماعی کام کے لیے بنیادی نظریات اور سمت واضح ہونا ضروری ہے۔ اگر مقصد ہی واضح نہ ہو تو مختلف سرگرمیاں ایک مربوط جدوجہد نہیں بن سکتیں۔

لیکن نظریاتی وضاحت کے ساتھ عملی وسعت بھی ہونی چاہیے۔ لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہر شخص سے ایک ہی رفتار، ایک ہی کردار اور ایک ہی طرزِ اظہار کی توقع نہ رکھی جائے۔

یوں تنظیم انسان کی انفرادیت ختم کرنے کے بجائے اس کی صلاحیت کو اجتماعی خیر میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

دعوت کا اصل حاصل

وقت کے ساتھ میری دعوت کی تعریف بھی تبدیل ہوئی۔

دعوت میرے لیے اب کسی شخص کو بحث میں شکست دینے یا فوراً اپنے موقف پر لے آنے کا نام نہیں رہی۔ یہ ایک طویل تربیتی عمل ہے:

انسان کو سمجھنا، اعتماد پیدا کرنا، مشترکات تلاش کرنا، سوال پیدا کرنا، تدریج سے فکر متعارف کرانا، اس کی صلاحیت کو پہچاننا اور بالآخر اسے اجتماعی ذمہ داری کا شعور دینا۔

اس پورے تجربے نے میرے شعوری سفر میں ایک بنیادی اصول واضح کر دیا: دعوت کا مقصد لوگوں کو اپنے جیسا بنانا نہیں، بلکہ انہیں سوچنے، سمجھنے اور اپنی صلاحیت کے مطابق خیر کے اجتماعی عمل میں شریک ہونے کے قابل بنانا ہے۔

اور شاید یہی دعوت کا وہ مقام ہے جہاں ایک فرد کی فکری بیداری آہستہ آہستہ معاشرتی شعور میں ڈھلتی ہے۔ یہاں دعوت محض ایک فرد تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسان سازی سے اجتماع سازی، اور اجتماع سازی سے سماجی تبدیلی کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔

میرے شعوری سفر میں دعوت کے اصولوں پر غور کے بعد اگلا سوال تربیت کا تھا۔ کسی انسان سے رابطہ قائم ہو جانا، اسے کسی فکر سے متعارف کرادینا یا کسی اجتماعی سرگرمی میں شامل کر لینا سفر کا اختتام نہیں، بلکہ اصل میں ایک نئے مرحلے کا آغاز ہے۔

میرے نوٹس میں دعوت کے عمل کو ایک مثلث (Triangle) کی صورت میں سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے: داعی، رابطہ کار اور مدعو۔ اس تصور کے ساتھ دو ذمہ داریاں بھی سامنے آتی ہیں: نئے لوگوں کو ساتھ ملانا اور پہلے سے وابستہ لوگوں کو جوڑے رکھنا۔ لیکن ان دونوں سے پہلے ایک بنیادی کام ضروری ہے — مدعو کو سمجھنا۔

یہ سوچ میرے گزشتہ دعوتی اصولوں ہی کا تسلسل تھی کہ ہر انسان مختلف ہے، اس لیے دعوت کا آغاز دوسرے انسان کو سمجھنے سے ہونا چاہیے۔

انسان کو کسی سانچے میں ڈھالنا مقصد نہیں

دعوت و تربیت میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر ایک مخصوص ذہنی سانچے بنا لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ آنے والا ہر شخص اسی سانچے میں ڈھل جائے۔

لیکن انسان مشین کے پرزے نہیں ہیں۔

ہر شخص کی طبیعت مختلف ہے، اس کا مزاج مختلف ہے، اس کی قابلیت، تعلیم، تجربہ، معاشرتی پس منظر

اور سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ اسی لیے پہلے بھی میرے سامنے یہ اصول واضح ہوا تھا کہ اجتماعی جدوجہد کا

مقصد سب کو ایک جیسا بنانا نہیں بلکہ مختلف صلاحیتوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے منظم کرنا ہے۔

اس لیے تربیت کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ

”یہ شخص بالکل میری طرح سوچنے لگے۔“

بلکہ اصل سوال یہ ہونا چاہیے

”کیا یہ شخص خود سوچنے، حقیقت کو سمجھنے اور صحیح و غلط میں شعوری امتیاز پیدا کرنے کے قابل ہو رہا ہے؟“

یہ فرق میرے لیے بہت بنیادی تھا۔

تربیت کا مقصد صرف نظریہ بتانا نہیں بلکہ انسان میں نظریے کو جانچنے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ہے۔

میرے نوٹس میں اس حوالے سے چند اہم پیمانے سامنے آتے ہیں۔ کسی فکری نظریے کو صرف جذباتی

وابستگی کی بنیاد پر قبول کرنے کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں، اس کی عملی

منطق کیا ہے، وہ انسانی معاشرے کو کس طرح سمجھتا ہے، بدلتے ہوئے حالات کا کس حد تک ادراک

رکھتا ہے، اور عملی زندگی میں اس کا تسلسل اور معنویت کیسے برقرار رہتی ہے۔

اس مرحلے پر دعوت محض معلومات کی منتقلی نہیں رہتی بلکہ فکری تربیت بن جاتی ہے۔

میں کسی انسان کو یہ نہیں سکھا رہا کہ کیا سوچنا ہے؛ میں اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش

کر رہا ہوں کہ وہ کیسے سوچے۔

جامد فکر کے بجائے زندہ شعور

کوئی فکر اگر صرف یاد کیے ہوئے جملوں تک محدود ہو جائے تو نئے حالات میں انسان پریشان ہو جاتا ہے۔

وہ ہر نئے سوال کا جواب پرانے الفاظ میں تلاش کرنے لگتا ہے۔

لیکن معاشرہ بدلتا رہتا ہے۔

نئے معاشی حالات پیدا ہوتے ہیں، نئی ٹیکنالوجی آتی ہے، نئی سماجی پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں اور نئی نسل مختلف سوالات کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

اس لیے تربیت ایسی ہونی چاہیے جو بنیادی اصولوں کو محفوظ رکھتے ہوئے نئے حالات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا کرے۔

یہی زندہ فکر اور جامد فکر کا فرق ہے۔

سوال کا جواب دینے کا طریقہ

میرے نوٹس کا ایک اہم حصہ اس سوال کے گرد گھومتا ہے کہ کسی کے سوال کا جواب کیسے دیا جائے؟ میں نے محسوس کیا کہ داعی یا مربی کے لیے ہر سوال کا فوری جواب جاننا اتنا اہم نہیں جتنا سوال کو صحیح طور پر سمجھنا۔

سب سے پہلے سوال کو پوری توجہ سے سننا چاہیے۔

اگر سوال واضح نہ ہو تو اس کی وضاحت طلب کی جائے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ سوال کرنے والا دراصل جاننا کیا چاہتا ہے۔ کبھی زبان پر آنے والا سوال اصل سوال نہیں ہوتا؛ اس کے پیچھے کوئی تجربہ، الجھن یا بنیادی فکری مسئلہ موجود ہوتا ہے۔

پھر سوال کو اس بڑی فکر سے جوڑا جائے جس سے اس کا تعلق ہے۔

اس طریقے سے جواب صرف ایک نہیں رہتا بلکہ انسان کو پورے مسئلے کا تناظر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اور بعض اوقات ایک اچھے جواب کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ تمام سوال ختم ہو جائیں، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ

ایک بہتر اور زیادہ بنیادی سوال پیدا ہو جائے۔

یہی فکری تربیت ہے۔ پچھلے مرحلے میں بھی میرے لیے یہ اصول واضح ہوا تھا کہ تیار شدہ جوابات دینے

سے زیادہ اہم انسان میں سوال اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔

ہر شخص دعوت کے ایک ہی کام کے لیے موزوں نہیں

اس غور و فکر کے دوران ایک اور حقیقت میرے سامنے واضح ہوئی

ضروری نہیں کہ ہر فرد دعوت کے ہر میدان کے لیے موزوں ہو۔

کسی کی طبیعت لوگوں سے فوری تعلق بنانے کی ہوتی ہے، کسی کی نہیں۔ کوئی گفتگو میں مؤثر ہوتا ہے، کوئی

مطالعہ اور تحقیق میں۔ کوئی تنظیم سازی کر سکتا ہے، کوئی تعلیم و تربیت میں بہتر ہوتا ہے اور کوئی عملی

خدمت کے ذریعے لوگوں کا اعتماد حاصل کرتا ہے۔

اس لیے لوگوں کی طبیعت، مزاج اور قابلیت کو سمجھنا بغیر انہیں ایک ہی کردار میں ڈالنے کی کوشش

نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

یہ بات میرے گزشتہ تجربے کی بھی توثیق تھی کہ ہر شخص سے ایک ہی رفتار اور ایک ہی طرزِ اظہار کی

توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

فرد کو پہچانو، پھر ذمہ داری دو

اجتماعی کام میں ایک فرد کو محض اس بنیاد پر ذمہ داری نہیں دی جانی چاہیے کہ ہمیں اس جگہ کسی آدمی کی ضرورت ہے۔

پہلے یہ سمجھنا چاہیے

اس کی فطری صلاحیت کیا ہے؟

اسے کس کام میں خوشی محسوس ہوتی ہے؟

وہ لوگوں کے ساتھ بہتر کام کرتا ہے یا علمی کام میں؟

وہ رابطہ کار بن سکتا ہے، مربی، منتظم یا کسی اور شعبے میں زیادہ مفید ہو سکتا ہے؟ صحیح انسان کو غلط جگہ رکھ

دینا کبھی کبھی ایک اچھی صلاحیت کو ضائع کر دیتا ہے۔

تبدیلی پیدا کرنا، وابستگی نہیں

دعوت و تربیت پر غور کرتے ہوئے میرے لیے ایک اور اہم فرق سامنے آیا۔

کسی شخص کا ہمارے قریب آ جانا، ہماری مجلس میں بیٹھنا یا ہماری سرگرمیوں میں شریک ہونا اپنی جگہ اہم ہو سکتا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے:

کیا اس انسان کے شعور، کردار اور اجتماعی ذمہ داری کے احساس میں کوئی مثبت تبدیلی پیدا ہوئی؟

اگر تعلق بڑھ گیا لیکن سوچ نہیں بدلی، سوال پیدا نہیں ہوئے، کردار میں بہتری نہیں آئی اور معاشرے

کے بارے میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوا، تو تربیت کا مقصد ابھی مکمل نہیں ہوا۔

دعوت کا ہدف صرف وابستہ افراد کی تعداد بڑھانا نہیں ہونا چاہیے؛ اصل ہدف ایسے باشعور انسان تیار کرنا

ہے جو خود حقیقت کو سمجھ سکیں اور دوسروں کے لیے خیر کا ذریعہ بن سکیں۔

فرد سے اجتماعی شعور تک

یہاں میرے لیے دعوت، تربیت اور تنظیم ایک دوسرے سے جڑنے لگے۔

دعوت انسان تک پہنچتی ہے۔

تربیت اس کی فکر اور کردار کو سنوارتی ہے۔

اور اجتماعی عمل اس فرد کی صلاحیت کو معاشرے کی بہتری سے جوڑ دیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں میرے کتاب کے مرکزی تصور ”انفرادیت سے اجتماعیت“ کا عملی مفہوم زیادہ

واضح ہونے لگا۔

اجتماعیت کا مطلب اپنی انفرادی شخصیت کو دینا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی

صلاحیت کو ایک بڑے انسانی اور اجتماعی مقصد سے جوڑ دے۔

اسی لیے میرے شعوری سفر میں دعوت کی تعریف آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی گئی۔ پہلے شاید میں اسے

لوگوں تک ایک بات پہنچانے کا عمل سمجھتا تھا۔ اب میں اسے زیادہ وسیع انداز میں دیکھنے لگا:

دعوت انسان تک پہنچنے کا نام ہے، تربیت اس کے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا نام ہے، اور تنظیم

مختلف صلاحیتوں کو اجتماعی خیر کے لیے مربوط کرنے کا نام ہے۔

ایک کامیاب داعی وہ نہیں جو ہر سوال کا جواب خود دے دے۔

ایک کامیاب مربی وہ بھی نہیں جو اپنے زیر تربیت افراد کو اپنے ہی سانچے میں ڈھال دے۔

میرے نزدیک اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان کے اندر سوال کرنے، سمجھنے، نظریے کو جانچنے، حالات کا

تجزیہ کرنے، اپنی صلاحیت پہچاننے اور اجتماعی ذمہ داری قبول کرنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اور شاید

دعوت و تربیت کا سب سے خوبصورت نتیجہ یہی ہے کہ ایک وقت کے بعد انسان کو ہر قدم پر کسی

دوسرے کے جواب کی ضرورت نہ رہے؛ اس کے اندر ایسا شعور پیدا ہو جائے جو اسے نئے حالات میں

بھی اصولوں کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے قابل بنادے۔ یہی میرے لیے دعوت سے تربیت،

تربیت سے شعور، اور شعور سے اجتماعیت تک کا سفر تھا۔

باب ہشتم

جماعت اور اجتماعی نظم — باطن سے ظاہر تک

جماعت سازی کے دو مرحلے

اس غور و فکر میں میرے سامنے جماعت سازی کا ایک نہایت اہم تصور آیا۔ حقیقی اجتماعی تبدیلی باہر سے

شروع نہیں ہوتی۔ اس کے دو مرحلے ہیں:

1۔ خلافتِ باطنی

2۔ خلافتِ ظاہرہ

میرے لیے ان دونوں کو الگ سمجھنا بہت ضروری تھا، کیونکہ ظاہری تنظیم اگر داخلی تربیت کے بغیر قائم ہو تو اس کا ڈھانچہ تو بن سکتا ہے، مگر اس میں مطلوبہ روح پیدا نہیں ہوتی۔

جب فکر انسان کے اندر واضح ہو جائے، کردار میں اس کے آثار پیدا ہوں اور ایسے افراد باہم ایک اجتماعی مقصد کے تحت مربوط ہونے لگیں تو اگلا مرحلہ خلافتِ ظاہرہ کا آغاز ہوتا ہے۔

میں اسے External Exhibition — داخلی شعور کا ظاہری، عملی اور اجتماعی اظہار سمجھنے لگا۔

اب جو اصول فرد نے اپنے اندر قبول کیے تھے، وہ اس کے تعلقات، اداروں اور اجتماعی عمل میں ظاہر ہونے چاہئیں۔

اگر اندر عدل کا تصور ہے تو باہر معاملات میں عدل دکھائی دے۔

اگر اندر مشاورت کی قدر ہے تو تنظیم کے فیصلوں میں مشاورت نظر آئے۔

اگر اندر انسان کے احترام کا تصور ہے تو جماعت کے کمزور ترین فرد کے ساتھ رویے میں بھی وہ احترام موجود ہو۔

اگر اندر اجتماعی مفاد کا شعور ہے تو ذمہ داری اور اختیار ذاتی مفادات کے حصول کا ذریعہ نہ بنیں۔

یوں خلافتِ ظاہرہ، خلافتِ باطنی کا عملی امتحان بھی ہے۔

کیونکہ جو نظریہ صرف کتاب، درس یا گفتگو میں خوبصورت نظر آئے لیکن عملی تعلقات اور اجتماعی نظام میں ظاہر نہ ہو سکے، اس کی تربیت ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

تنظیم پہلے انسان کے اندر بنتی ہے

جب چند افراد کے اندر مقصد کی یکسانیت، فکر کی وضاحت، کردار کی مضبوطی، اختلاف برداشت کرنے کی صلاحیت، مشاورت اور اجتماعی ذمہ داری پیدا ہو جائے تو ان کا اجتماع محض افراد کا ہجوم نہیں رہتا بلکہ ایک جماعت بننے لگتا ہے۔

اور یہی جماعت جب اپنے داخلی اصولوں کو معاشرے کے سامنے عملی نمونے کی صورت میں پیش کرتی ہے تو خلافتِ باطنی، خلافتِ ظاہرہ کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے۔

اس کا جواب دو مسلسل مراحل میں نظر آیا

خلافتِ باطنی: پہلے انسان کے اندر فکر، کردار، نظم اور ذمہ داری پیدا ہو۔ خلافتِ ظاہرہ: پھر یہی داخلی

شعور فرد کے کردار، جماعت، اداروں اور معاشرے میں عملی صورت اختیار کرے۔ یوں میرے لیے جماعت محض لوگوں کا اکٹھا ہونا نہیں رہی۔ جماعت ایک مشترک شعور، مشترک مقصد، تربیت یافتہ افراد اور منظم اجتماعی عمل کا نام بن گئی۔

اور یہاں انفرادیت سے اجتماعیت کا مفہوم مزید واضح ہو گیا

اپنی ذات کو مٹانا نہیں، بلکہ اپنی ذات کی اصلاح کر کے اسے اجتماعی خیر کے لیے وقف کرنا؛ پہلے اپنے اندر نظام فکر و کردار قائم کرنا اور پھر اسی نظام کو عملی اور اجتماعی زندگی میں ظاہر کرنا۔

اندر کی اصلاح سے باہر کی تعمیر تک کا یہی سفر میرے لیے خلافت باطنی سے خلافت ظاہرہ تک کا سفر تھا۔ میرے شعوری سفر میں دعوت کے مختلف پہلو بتدریج واضح ہوتے گئے۔ پہلے میں نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ مدعو کو کیسے سمجھا جائے، اس کی فکری سطح سے گفتگو کیسے شروع کی جائے اور اسے اپنے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے اس کے اندر سوچنے کی صلاحیت کیسے پیدا کی جائے۔ پھر یہ سوال سامنے آیا کہ ایک صحیح جماعت کی پہچان کیا ہے اور فرد کی داخلی تربیت کس طرح اجتماعی کردار میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی سفر میرے لیے خلافت باطنی سے خلافت خارجی کی طرف پیش رفت بنا۔

اب اگلا سوال زیادہ عملی تھا

اگر دعوت ایک ذمہ داری ہے تو اسے صحیح طریقے سے سیکھا کیسے جائے؟

میرے ان نوٹس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ دعوت صرف جوش، اچھی نیت یا گفتگو کی مہارت کا نام

نہیں۔ اس کے لیے نظریاتی وضاحت، انسانی نفسیات کی سمجھ، مسلسل تربیت، مضبوط تعلق اور اپنے کردار کی اصلاح ضروری ہے۔

دعوت سیکھنے کا پہلا سبق یہ تھا کہ داعی کے پاس اپنی فکر کی وضاحت ہونی چاہیے۔ اگر مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کس مقصد کے لیے لوگوں سے رابطہ کر رہا ہوں، معاشرے کے مسئلے کو کس زاویے سے دیکھتا ہوں اور مطلوبہ تبدیلی کیا ہے، تو میری دعوت محض جذباتی گفتگو بن سکتی ہے۔
دعوت نظریے اور انسان کے درمیان ایک زندہ تعلق ہے۔

نظریہ سمت دیتا ہے، لیکن انسان کو سمجھنا طریقہ سفر متعین کرتا ہے۔

نظریاتی تربیت کے بنیادی پہلو

میرے نوٹس میں نظریاتی تربیت کے کئی پہلو سامنے آئے۔ میرے لیے ان کا مفہوم یہ تھا کہ نظریہ محض چند اصطلاحات یاد کرنے کا نام نہیں، بلکہ ایک مربوط فکری نظام کو سمجھنے کا عمل ہے۔

نظام کیا ہے؟ اس کی بنیادی فکر کیا ہے؟ نظریے کے مختلف اجزا آپس میں کس طرح مربوط ہیں؟ اجتماعی

زندگی اور فرد کے کردار کے درمیان کیا تعلق ہے؟ مختلف حالات میں اصول کو عملی صورت کیسے دی

جائے؟ اور جب حالات تبدیل ہوں تو بنیادی فکر کو برقرار رکھتے ہوئے حکمت عملی میں مناسب تبدیلی

کیسے لائی جائے؟

یہ سوالات مجھے محض نظریہ یاد کرنے سے نظریہ سمجھنے کی طرف لے گئے۔

مجھے یہ بات اہم محسوس ہوئی کہ نظریہ اگر صرف زبان پر ہو اور انسان کی سوچ، فیصلوں اور رویوں میں نہ اترے تو تربیت ابھی سطحی ہے۔

دعوت تعلق سے شروع ہوتی ہے

میرے نوٹس کا ایک نہایت اہم حصہ زیادہ تعلق اور نظریے کو نقصان پہنچانے کے خطرے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یہ ایک باریک توازن ہے۔

ایک طرف دعوت کے لیے انسانوں کے ساتھ تعلق ضروری ہے۔ اعتماد کے بغیر گہری فکری گفتگو مشکل

ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر تعلق اتنا غالب ہو جائے کہ ہم اصولی بات کہنا چھوڑ دیں، غلط رویے کو

صرف تعلق بچانے کے لیے نظر انداز کرنے لگیں یا دعوت کا مقصد ہی دوستی برقرار رکھنا بن جائے تو

نظریہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

اس لیے مجھے یہ اصول سمجھ آیا

تعلق نظریے تک پہنچنے کا پل ہے؛ نظریے کا متبادل نہیں۔

داعی کو انسان کے قریب ہونا چاہیے، لیکن اپنی فکری سمت کھو کر نہیں۔

دعوت کا انداز نرم ہونا چاہیے۔ انسان کو عزت، محبت اور خیر خواہی محسوس ہونی چاہیے۔ لیکن محبت کا

مطلب یہ نہیں کہ ہر بات پر خاموشی اختیار کی جائے۔

اسی طرح اصولی موقف رکھنے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان سخت، تحکمانہ یا تحقیر آمیز ہو جائے۔ یہی

دعوت کی تربیت کا مشکل حصہ ہے

انسان اپنے خاندان، روزگار، تعلیم، معاشرتی نا انصافی، اخلاقی مسائل اور مستقبل کے سوالات کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔

اس لیے دعوت میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہمارا نظریہ ان حقیقی مسائل کو کیسے سمجھتا ہے اور ان کے حل کے لیے کیا اصول فراہم کرتا ہے۔

نظریہ صرف درس میں خوبصورت محسوس نہ ہو؛ زندگی میں بھی رہنمائی دے۔

فرد سے تعلق، جماعت سے وابستگی

یہاں مجھے ایک اور اہم فرق سمجھ آیا۔

اگر کسی شخص کا پورا تعلق صرف ایک داعی کے ساتھ قائم ہو جائے تو اس میں ایک کمزوری پیدا ہو سکتی ہے۔ داعی کے دور ہونے، اختلاف پیدا ہونے یا حالات بدلنے سے اس فرد کا پورا اجتماعی تعلق متاثر ہو سکتا ہے۔ اس لیے دعوت کا مقصد کسی شخص کو اپنے ساتھ باندھنا نہیں ہونا چاہیے۔ اسے فکر، مقصد اور اجتماع سے جوڑنا چاہیے۔

اچھا داعی لوگوں کو اپنی شخصیت کا تابع نہیں بناتا؛ انہیں مقصد کے ساتھ جوڑتا ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو

میرے پچھلے غور و فکر سے بھی جڑتا تھا کہ مضبوط جماعت وہ ہوتی ہے جس میں افراد کا تعلق صرف

شخصیات کے ذریعے قائم نہ رہے بلکہ ایک واضح نظام اور مشترک مقصد کے ساتھ قائم ہو۔

تعلق کی دو سطحیں

میرے نوٹس میں جماعت کی تیاری کے ضمن میں تعلق کی دو سطحیں بھی نمایاں ہوئیں: انسان مختلف لوگوں سے رابطہ رکھے۔ صرف اپنے جیسے لوگوں کے درمیان محدود نہ ہو جائے۔ مختلف مزاج، پیشوں، سماجی طبقات اور ذہنی سطح رکھنے والے انسانوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ تعلق محض میل جول نہ ہو؛ اس کے اندر مقصد موجود ہو۔

اس کے ساتھ ایسے تعلقات بھی ضروری ہیں جن میں اعتماد، اخلاص اور خیر خواہی زیادہ گہری ہو۔ ایسے لوگ جن کے ساتھ انسان کھل کر سوچ سکے، مشورہ کر سکے، اپنی کمزوری تسلیم کر سکے اور جن کے ساتھ تعلق محض تنظیمی ضرورت پر قائم نہ ہو۔

یہ دونوں سطحیں مل کر دعوتی شخصیت میں توازن پیدا کرتی ہیں۔

تعلقات کی وسعت، مگر مقصد کی وحدت

دعوت کا کام چند مخصوص لوگوں تک محدود ہو جائے تو معاشرے کے مختلف طبقات کو سمجھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔

اس لیے اپنے حلقہ تعلق کو وسیع کرنا ضروری ہے۔

لیکن صرف جان پہچان بڑھانا دعوت نہیں۔

اصل مقصد یہ ہے کہ انسان معاشرے کو سمجھے، لوگوں کے مسائل جانے، ان کے ساتھ اعتماد پیدا کرے اور جہاں مناسب ہو انہیں ایک بڑی اجتماعی فکر سے متعارف کرائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں دعوت کو اب لوگ اکٹھے کرنے کا عمل نہیں سمجھتا تھا۔ یہ انسانوں کے درمیان ایسے شعوری روابط پیدا کرنے کا عمل تھا جو بالآخر اجتماعی خیر کا ذریعہ بن سکیں۔

داعی کا سب سے طاقتور پیغام: اس کا کردار

ان تمام اصولوں کے باوجود میرے لیے ایک حقیقت سب سے نمایاں ہوتی گئی: دعوت کا سب سے مؤثر ذریعہ خود داعی کی شخصیت ہے۔

اگر میری گفتگو عدل کے بارے میں ہو لیکن میرے معاملات میں نا انصافی ہو؛ اگر میں اجتماعیت کی بات کروں لیکن اپنی رائے پر اصرار کرتا رہوں؛ اگر میں اخلاق کی دعوت دوں مگر اختلاف میں زبان اور رویے پر قابو نہ رکھ سکوں، تو میری گفتگو اپنی تاثیر کھو دے گی۔

لوگ صرف یہ نہیں سنتے کہ ہم کیا کہتے ہیں۔

وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہم کیسے جیتے ہیں۔

اسی لیے دعوت کی پہلی درگاہ شاید مجلس نہیں بلکہ اپنی ذات ہے۔

دعوت پہلے مجھے بدلتی ہے

یہاں میرے شعوری سفر کا ایک خوبصورت دائرہ مکمل ہونے لگا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میں دوسروں کی تربیت کر رہا ہوں، لیکن حقیقت میں دعوت مسلسل میری اپنی تربیت بھی کر رہی تھی۔

کسی کا اعتراض میرے تحمل کا امتحان تھا۔

کسی کا اختلاف میرے ظرف کا امتحان تھا۔

کسی کی بے توجہی میرے اخلاص کا امتحان تھی۔

کسی کی کامیابی میرے اندر حسد یا خیر خواہی کا امتحان تھی۔

اور کسی کمزور ساتھی کے ساتھ میرا رویہ اس بات کا امتحان تھا کہ اجتماعیت میرے لیے صرف نظریہ ہے یا واقعی کردار بن چکی ہے۔

اس مرحلے پر دعوت میرے لیے تقریر، بحث یا لوگوں کو کسی حلقے میں شامل کرنے کا نام نہیں رہی۔

میں اسے تین دائروں میں دیکھنے لگا

فکر کی تربیت → تعلق کی تعمیر → کردار کی گواہی

فکر مجھے بتاتی ہے کہ مقصد کیا ہے۔

تعلق مجھے سکھاتا ہے کہ انسان تک کیسے پہنچنا ہے۔

اور کردار ثابت کرتا ہے کہ جس فکر کی دعوت میں دے رہا ہوں، اس نے خود مجھے کتنا بدلا ہے۔

داعی کی کامیابی صرف اس سے نہیں ناپی جاسکتی کہ اس نے کتنے لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا؛ اصل سوال یہ

ہے کہ اس نے کتنے انسانوں میں سوچنے کی صلاحیت، خیر کا شعور، مضبوط کردار اور اجتماعی ذمہ داری پیدا

کرنے میں حصہ ڈالا—اور اس پورے عمل نے خود اس کے کردار کو کتنا بہتر بنایا۔

یہاں مجھے محسوس ہوا کہ دعوت دراصل دو انسانوں کے درمیان یک طرفہ تعلق نہیں۔ ایک انسان

دوسرے کو دعوت دیتا ہے، مگر اسی سفر میں خود بھی سیکھتا، بدلتا اور تربیت پاتا ہے۔

اور شاید یہی میرے لیے دعوت سیکھنے کا سب سے بنیادی سبق تھا:

دعوت دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی ذات کی مسلسل اصلاح کا سفر ہے۔

باب نہم

اخلاق، نظام اور اجتماعی تبدیلی

میرے شعوری سفر میں ایک وقت ایسا آیا جب میں اخلاقی برائیوں کو زیادہ تر افراد کی کمزوری کے طور پر دیکھتا تھا۔ جھوٹ، بددیانتی، خود غرضی، نا انصافی، استحصال یا دوسروں کے حقوق کی پامالی — بظاہر یہ سب کسی نہ کسی فرد ہی سے صادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک سادہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر افراد اچھے ہو جائیں تو معاشرہ بھی اچھا ہو جائے گا۔

لیکن اجتماعی فکر کے مطالعے نے میرے سامنے ایک زیادہ گہرا سوال کھڑا کر دیا: کیا معاشرے کی اخلاقی خرابیاں صرف خراب افراد پیدا کرتے ہیں، یا ایک خراب نظام بھی مسلسل ایسے رویے پیدا اور مضبوط کرتا رہتا ہے؟

یہ سوال میرے لیے فرد سے نظام کی طرف سفر کا آغاز تھا۔

اخلاقی برائی صرف فرد کا مسئلہ نہیں

انسان خلا میں زندگی نہیں گزارتا۔ وہ ایک خاندان، معیشت، ادارے، ریاست اور پورے معاشرتی نظام کے اندر رہتا ہے۔ اس نظام میں کچھ اعمال کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، کچھ کی حوصلہ شکنی، بعض رویوں پر فائدہ ملتا ہے اور بعض اصولی رویوں کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

اگر کسی معاشرے کا نظام ایسا بن جائے کہ خود غرضی فائدہ دے، طاقتور کے لیے قانون مختلف ہو،

استحصال سے ترقی کے مواقع ملیں اور اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے والے لوگ زیادہ کامیاب دکھائی دیں، تو اخلاقی خرابی کو صرف فرد کی کمزوری قرار دینا مسئلے کی پوری تصویر نہیں دکھاتا۔

فرد کے اعمال اہم ہیں، لیکن وہ جس نظام کے اندر فیصلے کر رہا ہے، وہ نظام بھی اس کے رویے کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔

یہی وہ نکتہ تھا جس نے میرے لیے اخلاق اور نظام کے تعلق کو بدل دیا۔

غلط نظام میں اچھا کام کرنے کا تضاد

اس مرحلے پر میرے سامنے ایک مشکل سوال آیا

اگر نظام غلط ہے لیکن ایک شخص اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے دیانت داری اور نیک نیتی سے اچھا کام کر رہا ہے تو کیا یہ کافی نہیں؟

پہلی نظر میں اس کا جواب ہاں معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم وہ خود تو برائی نہیں کر رہا۔ وہ اپنے حصے کا اچھا کام کر رہا ہے۔

لیکن میرے نوٹس میں سامنے آنے والا اصول اس سے آگے جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص ایک بنیادی طور پر غلط نظام میں صرف اپنی ذات کو اچھا رکھنے پر اکتفا کرے، لیکن اس نظام کے غلط اصولوں، نا انصافی اور برائی پیدا کرنے والے ڈھانچے کو چیلنج نہ کرے، تو بعض حالات میں اس کی اچھی کارکردگی بھی اسی نظام کو چلتے رہنے میں مدد دے سکتی ہے۔

وہ خود ظلم نہیں کر رہا، لیکن وہ اس مشین کا ایک اچھا پرزہ بن سکتا ہے جس کا مجموعی نتیجہ درست نہیں۔ یہ میرے لیے ایک سخت مگر اہم فکری سوال تھا کیا میرا اچھا کردار صرف مجھے اچھا بناتا ہے، یا میرے ذریعے ایک غلط نظام بھی زیادہ مؤثر انداز میں چل رہا ہے؟

یہاں میں نے سمجھا کہ انفرادی نیکی اور اجتماعی اصلاح کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

نظام بدلے بغیر اخلاقی اصلاح کیوں نامکمل ہے؟

اگر ایک نظام مسلسل ایسے حالات پیدا کر رہا ہو جن میں لوگوں کو غلط کام کی طرف دھکیلا جاتا ہے، تو صرف اخلاقی نصیحت سے مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوگا۔

ہم ایک فرد کو دیانت داری سکھائیں گے، مگر اگر پورا معاشی یا انتظامی ڈھانچہ اسے بددیانتی پر فائدہ دے رہا ہے تو اس کے لیے دیانت پر قائم رہنا مسلسل مشکل بنایا جاتا رہے گا۔

ہم عدل کی تعلیم دیں گے، لیکن اگر اجتماعی ادارے نا انصافی کو تحفظ دے رہے ہوں تو عدل چند اچھے انسانوں کی ذاتی خوبی بن کر رہ جائے گا۔ اس لیے میرے لیے یہ اصول واضح ہوا

اخلاقی تربیت ضروری ہے، لیکن اخلاقی اصلاح کو پائیدار بنانے کے لیے ایسا اجتماعی نظام بھی ضروری ہے جو خیر کی حفاظت کرے اور شر کی حوصلہ شکنی کرے۔

یہاں فرد کی اصلاح کی اہمیت ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ فرد کی اصلاح اور نظام کی اصلاح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اچھے انسان نظام بدلتے ہیں، اور اچھا نظام اچھے انسانوں کو قائم رہنے میں مدد دیتا ہے۔

سیرت نبوی ﷺ سے نظام کی تبدیلی کا اصول

اسی تناظر میں میں نے رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کو بھی ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی۔

آپ ﷺ کی دعوت کا آغاز انسان کے عقیدے، فکر اور اخلاق کی اصلاح سے ہوا، لیکن یہ دعوت صرف انفرادی اخلاقیات تک محدود نہیں رہی۔ مکہ میں توحید کی دعوت کے ساتھ اس معاشرے کی ان خرابیوں کو بھی چیلنج کیا گیا جن میں ظلم، استحصال، طبقاتی تفاوت، کمزوروں کے حقوق کی پامالی اور طاقت کے غلط استعمال کے رویے موجود تھے۔

بعد میں مدینہ میں ایک اجتماعی نظم وجود میں آیا جس میں عقیدہ اور اخلاق محض انفرادی نصیحت نہیں رہے بلکہ اجتماعی تعلقات اور ذمہ داریوں میں بھی ان کا اظہار ہوا۔

میرے لیے سیرت سے نکلنے والا بنیادی سبق یہ بنا

انسان کی داخلی اصلاح اور معاشرے کے اجتماعی نظام کی اصلاح کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کو میں نے یوں سمجھا کہ مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ ایک خراب ماحول میں چند اچھے انسان پیدا ہو جائیں؛ بلکہ ایسے انسان تیار ہوں جو عدل اور خیر پر مبنی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں کردار ادا کر سکیں۔

یہی میرے شعوری سفر میں دعوت سے تربیت، تربیت سے جماعت اور جماعت سے نظامی تبدیلی تک کا ربط تھا۔

غلط نظام میں کام کرنے کے تین اصول

لیکن یہاں ایک عملی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر موجودہ نظام مکمل طور پر درست نہیں تو جب تک اسے تبدیل نہیں کیا جاتا، انسان کیا کرے؟ کیا وہ نظام سے بالکل الگ ہو جائے؟ میرے نوٹس نے مجھے تین عملی اصولوں کی طرف متوجہ کیا

۱۔ خود غلط کام کا حصہ نہ بننا

سب سے پہلا اصول اپنی اخلاقی سرحد قائم رکھنا ہے۔

نظام میں رہنا اس بات کا جواز نہیں بن سکتا کہ انسان خود ظلم، بددیانتی، استحصال یا کسی واضح غلط عمل میں شریک ہو جائے۔

یعنی نظام کی خرابی کو اپنی خرابی کا جواز نہ بنایا جائے۔

۲۔ برائی کو اپنے ذریعے مضبوط نہ ہونے دینا

دوسرا مرحلہ صرف خود برائی سے بچنے سے آگے ہے۔

انسان کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کا کام کہیں بالواسطہ طور پر اسی غلط نظام کو مضبوط تو نہیں کر رہا۔ بعض

اوقات ایک شخص بظاہر کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوتا، لیکن اس کی صلاحیت، خاموشی یا تعاون ایسے

ڈھانچے کو زیادہ مؤثر بنا رہا ہوتا ہے جس کے نتائج نقصان دہ ہیں۔

اس لیے اپنے کردار کا جائزہ صرف نیت سے نہیں بلکہ نتیجے سے بھی لینا ضروری ہے۔

۳۔ حالات کو تبدیل کرنے کی کوشش جاری رکھنا

تیسرا اور فیصلہ کن اصول یہ ہے کہ انسان غلط نظام کو مستقل حقیقت سمجھ کر قبول نہ کر لے۔

جہاں ممکن ہو، حکمت، تدریج، دعوت، تربیت، مشاورت اور اجتماعی کوشش کے ذریعے اس نظام کو بہتر

نظام کی طرف تبدیل کرنے کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔

اس کا مطلب ہر وقت تصادم نہیں۔ تبدیلی بعض اوقات تعلیم سے آتی ہے، کبھی تنظیم سے، کبھی ادارہ

سازی سے، کبھی نئے متبادل پیدا کرنے سے اور کبھی لوگوں کے اندر اجتماعی شعور بیدار کرنے سے۔

اصل بات یہ ہے کہ غلط نظام میں رہنے کی مجبوری، غلط نظام کو درست سمجھ لینے میں تبدیل نہ ہو جائے۔

نیت سے آگے — نتیجے کی ذمہ داری

اس غور و فکر نے میرے شعوری سفر میں ایک اہم تبدیلی پیدا کی۔

میں پہلے اپنے عمل کو زیادہ تر اس سوال سے دیکھتا تھا:

”میری نیت کیا ہے؟“

اب اس کے ساتھ ایک دوسرا سوال بھی شامل ہو گیا

”میرے عمل کا اجتماعی نتیجہ کیا ہے؟“

ممکن ہے میری نیت اچھی ہو، لیکن اگر میرا عمل مسلسل ایک ایسے ڈھانچے کو مضبوط کر رہا ہے جو

دوسروں کے لیے نا انصافی پیدا کرتا ہے تو مجھے اپنے کردار پر دوبارہ غور کرنا ہو گا۔

یوں میرے لیے اخلاقیات صرف اچھا انسان بننے کا نام نہیں رہیں؛ اخلاقیات کا ایک اجتماعی پہلو بھی

سامنے آیا۔

انفرادیت سے اجتماعیت

یہ مرحلہ میری کتاب کے مرکزی عنوان ”انفرادیت سے اجتماعیت“ سے براہ راست جڑتا ہے۔

انفرادیت کی سطح پر سوال ہے

میں کیسا انسان ہوں؟

اجتماعیت کی سطح پر سوال ہے

جس نظام کا میں حصہ ہوں، وہ انسانوں کو کیسا بنا رہا ہے؟

اور شعوری جدوجہد کا سوال ہے

میں اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ اس اجتماعی نظام کو بہتر بنانے میں کیا کردار ادا کر رہا ہوں؟

یہیں مجھے محسوس ہوا کہ اخلاقی اصلاح اور نظامی اصلاح ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ لازم و ملزوم

ہیں۔

فرد کی اصلاح کے بغیر بہتر نظام بنانے والے لوگ کہاں سے آئیں گے؟

اور بہتر نظام کے بغیر اچھے افراد کی اخلاقی جدوجہد کو مستقل اجتماعی صورت کیسے ملے گی؟

میرے شعوری سفر میں یہی وہ مقام تھا جہاں نیکی ایک ذاتی وصف سے بڑھ کر اجتماعی ذمہ داری بن گئی۔

صرف غلط نظام میں اچھا رہنا کافی نہیں؛ اصل جدوجہد یہ ہے کہ خود بھی غلطی سے بچا جائے، اپنے عمل سے برائی کو تقویت بھی نہ دی جائے، اور حکمت کے ساتھ اس نظام کو بدلنے کی مسلسل کوشش بھی جاری رکھی جائے۔

باب دہم

انفرادیت سے اجتماعیت — سفر کا حاصل

کچھ سوال منزل نہیں دیتے؛ وہ سمت دیتے ہیں۔

جب میں اس سفر کو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ کسی ایک نظریے، استاد یا واقعے کی داستان نہیں لگتا۔ یہ سوالات کا ایک سلسلہ تھا۔ دوستوں نے سوال پیدا کیے، اساتذہ نے سمت دی، کتابوں نے دائرہ وسیع کیا، رفاقت نے کمزوریاں دکھائیں، گھر نے کردار کا امتحان لیا، پیشے نے ذمہ داری سکھائی، دعوت نے انسان کو سننا سکھایا، اور اداروں نے نظام کی حقیقت دکھائی۔

ابتدا میں سوال تھا: میں کیا بنوں؟ پھر سوال ہوا: میں کیسا انسان بنوں؟ اس کے بعد: میرا علم اور میری صلاحیت دوسروں کے لیے کیا معنی رکھتے ہیں؟ پھر: ہم مل کر کیا کر سکتے ہیں؟ اور آخر کار: ہم ایسے گھر، ادارے اور معاشرے کیسے بنائیں جن میں انسان کے لیے عدل، خیر، ذمہ داری اور بہتر انسان بننے کا راستہ آسان ہو؟

میں سے ہم تک، مگر اپنی ذات کو مٹائے بغیر

یہ سفر ”میں“ کی نفی نہیں تھا۔ فرد ضروری ہے۔ اپنی صحت، علم، کردار، گھر اور ذمہ داری کو سنبھالے بغیر اجتماعیت بھی کھوکھلی ہو سکتی ہے۔ لیکن ”میں“ آخری منزل بھی نہیں۔ اپنی صلاحیت کو صرف ذاتی کامیابی تک محدود رکھنا میرے لیے رفتہ رفتہ نامکمل محسوس ہوا۔ انفرادیت سے اجتماعیت کا مطلب اپنی شخصیت مٹانا نہیں، اسے ذمہ دارانہ خیر کے ساتھ جوڑنا ہے۔

میں نے یہ بھی سیکھا کہ شعور کا مطلب ہمیشہ درست ہونا نہیں۔ شعور یہ صلاحیت بھی ہے کہ انسان اپنی پرانی رائے کا جائزہ لے، غلطی تسلیم کرے، نئے حالات سمجھ سکے اور اصول باقی رکھتے ہوئے تدبیر بدل سکے۔ اسی لیے یہ کتاب کسی حتمی نتیجے پر ختم نہیں ہوتی۔

اگر پورے سفر کو ایک دائرے میں رکھوں تو ترتیب شاید یوں ہے: ذات، تعلق، تربیت، اجتماع، خدمت، محاسبہ، اور دوبارہ ذات۔

انسان اپنی اصلاح کرتا ہے، پھر دوسروں کے ساتھ کام کرتا ہے، اجتماعی تجربہ اس کی نئی کمزوریاں ظاہر کرتا ہے، اور وہ دوبارہ اپنی تربیت کی طرف لوٹتا ہے۔ یہی سفر جاری رہتا ہے۔

کامیابی کی تعریف بھی بدل گئی۔ صرف عہدہ، qualification یا آمدن نہیں؛ گھر، صحت، کردار، علم، خدمت اور اجتماعی اثر بھی اس میں شامل ہوئے۔ اور شاید اصل ذمہ داری پورا نتیجہ اپنے ہاتھ میں لینے کی نہیں، اپنے دائرے میں درست اور بامقصد کوشش جاری رکھنے کی ہے۔

اپنے آپ کو بہتر بناؤ، مگر صرف اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے ساتھ جڑو، مگر اپنی شخصیت مٹا کر نہیں۔ نظام کو بدلنے کی کوشش کرو، مگر اپنے کردار کو کھو کر نہیں۔ خیر کی جدوجہد جاری رکھو، مگر اس شعور کے ساتھ کہ ہم سب خود بھی مسلسل زیر تربیت ہیں۔

مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر عابد علی ملک ایک معالج، استاد اور فکری و تربیتی موضوعات کے طالب علم ہیں۔ ان کا پیشہ ورا نہ سفر طب، اطفال اور بچوں کے امراضِ قلب سے وابستہ رہا ہے۔ تدریس، تربیت، خاندانی زندگی، دعوت اور اجتماعی ذمہ داری کے تجربات نے ان کی تحریر کے بنیادی موضوعات تشکیل دیے۔ ”میرا شعوری سفر“ ان کے اسی ذاتی و فکری سفر کی روداد ہے جس میں وہ کامیابی کو صرف انفرادی پیش رفت نہیں بلکہ علم، کردار اور صلاحیت کو مشترکہ خیر سے جوڑنے کی کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں۔